ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

جولائی/ اگست ۲۰۱۹ء | جلد ۱۱ | شمارہ ۱و۲ | ذی القعدہ/ذی الحجہ ۱۴۴۰ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی
(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مجلس مشاورت

- مولانا سید سلمان الحسینی ندوی
- مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
- محمد قمر عالم لکھنوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی
- مولانا محمد اخلاق ندوی

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

معاون مدیر

محمد فرید حبیب ندوی

مجلس ادارت

- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
- محمد قمر الزماں ندوی

سرکولیشن انچارج

سعید احمد ندوی 9045616218
محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

شرح خریداری

فی شمارہ: 25:00روپے
سالانہ: 250:00روپے
سالانہ اعزازی ممبرشپ: 500:00روپے
بیرونی ممالک: $30 ڈالر
لائف ممبرشپ(۲۰سال): 4000:00روپے

Bank Acount Detail: Mr Saeed Ahmad Ansari
Acount No: 6561000100039197
IFSC code: PUNB0656100
Punjab National Bank, Medical Road, Aligarh-202002
Mob. 9808850029

خط و کتابت کا پتہ:
مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر ڈی کوارسی بائی پاس علی گڑھ
e-mail: nidaeaetidal@gmail.com

Designed and composed by Abdullah Maroofi, Mob. 8218439622; email-almarufi.abdullah369@gmail.com

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹر پرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی، علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation
Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at Ideal Graphics Enterprises, Patwari Nagla, Aligarh

visit us: www.nadwifoundationaligarh.org

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	اللہ سے پیمانِ وفا باندھنے والے	محمد عارف ندوی
۲۔	اداریہ	موب لنچنگ	مدیر ۳
۳۔	قند مکرر	عیدالاضحیٰ کا پیغام	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ۸
۴۔	پیام سیرت	جبل احد کی صدائے بازگشت	محمد فرید حبیب ندوی ۱۳
۵۔	عالم اسلام	تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں گے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ۱۵
۶۔	//	شہید قدسی محمد مرسیؒ	عبدالغفار عزیز ۲۳
۷۔	//	شاہ عبداللہ اور امام مرسی – دو کردار، دو انجام	ڈاکٹر محی الدین غازی ۲۸
۸۔	//	حافظ ڈاکٹر محمد مرسی شہیدؒ	مولانا سید احمد ومیض ندوی ۳۱
۹۔	نقوش و تاثرات	مولانا محمد غزالی ندویؒ (حیات وخدمات کے چند اہم گوشے)	محمد خالد ضیا صدیقی ندوی ۳۶
۱۰۔	//	آہ! اے دوست تجھے کیا لکھوں.....	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ۴۰
۱۱۔	//	کوئی محفل ہو، تیرا رنگِ محفل یاد آتا ہے	محمد فرید حبیب ندوی ۵۰
۱۲۔	//	آہ! مولانا محمد غزالی ندویؒ	محمد خالد ضیا صدیقی ندوی ۵۸
۱۳۔	//	میرے خورشید یہ موقع نہیں تھا ڈوب جانے کا	ابوطلحہ بنارسی ندوی ۶۸
۱۴۔	لائحہ عمل	اٹھ کہ پھر خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں	پروفیسر محسن عثمانی ندوی ۷۱
۱۵۔	مطالعۂ سیرت	پیغمبر انقلاب اور معاشرتی وقانونی مساوات	محمد قمر الزماں ندوی ۷۹
۱۶۔	تعلیم و تربیت	تربیت اولاد — چند اہم گوشے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ۸۲
۱۷۔	فقہیات	قربانی — احکام ومسائل	صدام حسین ندوی ۹۱
۱۸۔	منصوبہ بندی	سانحہ نہیں ٹلتا، سانحے پہ رونے سے	عبدالرشید طلحہ نعمانی ۹۲
۱۹۔	شعر و ادب	نعت پاک	احمد ندیم قاسمی

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

موب لنچنگ
(Mob Lynching)

آج کل ملک بھر میں فسطائیت کا بہت زور ہے، فاشسٹ طاقتوں کا عروج ہے، فاشسزم کے کھلے تسلط کی تمام تر علامتیں ظاہر ہو رہی ہیں، کچھ دلیر ارکانِ پارلیمنٹ نے پارلیمنٹ میں کھل کر اس پر مدلل گفتگو بھی کی ہے، اسی منظر نامہ کا ایک خطرناک اور کربناک حصہ بھیڑ کی غنڈہ گردی یعنی موب لنچنگ ہے، جس کو بہت سے لوگوں نے بڑی حد تک درست نام دیتے ہوئے سیاسی قتل Political killing سے تعبیر کیا ہے، لیکن میں اس سے بھی آگے بڑھ کر بہت پہلے سے کہتا آیا ہوں کہ یہ دراصل Political Terrorism یعنی سیاسی دہشت گردی ہے، جب جہاں الیکشن قریب ہوتا ہے وہاں اس طرح کے واقعات محض ووٹوں کی سیاست کے لیے انجام دیے جاتے ہیں، جھارکھنڈ کا تازہ واقعہ دیکھیے، چھ ماہ بعد وہاں الیکشن ہے، اس واقعہ سے آدی واسی اور مسلمان آمنے سامنے آگئے ہیں، جس کا راست طور پر نقصان کانگریس کو ہوگا اور فائدہ بی جے پی کو، اکثر واقعات میں گائے کی اسمگلنگ یا گائے کے قتل کو سبب بنایا جاتا ہے، عام طور پر واقعات کو انجام دینے والے دلت اور آدی واسی ہوتے ہیں، بی جے پی کی علاقائی لیڈرشپ مکمل پشت پناہی کرتی ہے، ایک بھی کیس میں سزا نہیں ہوتی، اگر ہوتی ہے تو فوراً رہائی ہو جاتی ہے، متعدد کیس ایسے ہیں جن میں بھیڑ میں آر ایس ایس اور بجرنگ دل کے لوگ بھی پیٹنے اور قتل کرنے میں شامل رہے۔

یہ دراصل خوف و دہشت پیدا کرنے کا ایک مجرب طریقہ ہے جو ایسا نہیں کہ نیا ہو، فاشسٹ طاقتیں پہلے بھی یہ طریقہ استعمال کرتی رہی ہیں اور ہر دور میں کیا، ایک غلام کو پوری بھیڑ کے ذریعہ جلانے، ایک شودر کو پوری بھیڑ کے ذریعہ پیٹنے جیسے ہزاروں واقعات تاریخ کا حصہ ہیں، دلتوں کی لنچنگ ہمیشہ ہوتی آئی ہے، بڑی طاقتیں یہ شکلیں بزعم خود دوسرے درجہ کے انسانوں کو قابو میں رکھنے کے لیے ہمیشہ استعمال کرتی آئی ہیں، البتہ اب نئی بات یہ ہے کہ ایسے گھناؤنے اور پرتشدد واقعات کی ویڈیو گرافی کی جاتی ہے اور پھر اسے وائرل کر کے خوف و دہشت کا ماحول بنانے میں کافی مدد ملتی ہے، سوال یہ ہے کہ اس بہیمانہ غنڈہ گردی کے سینکڑوں واقعات رونما ہو چکے مگر ہم نے، ہماری بڑی تنظیموں اور ملی قیادت نے اس کے لیے کیا مؤثر اقدامات کیے، آخر پہلے دوسرے واقعہ پر ہی کیوں اس طرح کی حکمت عملی نہیں اپنائی گئی کہ آگے یہ سلسلہ دراز نہ ہوتا، لوگ جگہ جگہ قتل کیے جاتے رہے مگر ہم یہ سمجھتے رہے کہ کہیں کسی علاقہ میں کوئی واقعہ ہوا ہوگا، یہ وہ لاپروائی تھی جس نے اس منظّم سیاسی دہشت گردی کا سلسلہ ایسا دراز کیا اور خوف و دہشت کی نفسیات کو اس طرح عام کیا کہ آج ہر شخص کو بھیڑ کے ذریعہ پیٹ پیٹ کر قتل کیے جانے کا خطرہ لاحق ہے، صحیح معنی میں تو ہماری سرکردہ تنظیموں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ آخر یہ سب کیوں ہو رہا ہے، اس کے اسباب کیا ہیں، اس سلسلہ کو روکنے کے لیے کیا کرنا

چاہیے، اگر کوئی اس کے لیے آواز بلند کر رہا ہے، کام کر رہا ہے تو اس کی کس طرح مدد کرنا چاہیے، اس سلسلے میں سب سے زیادہ کام India against Hate نامی تنظیم نے کیا ہے، اس تنظیم کے پاس اس سلسلہ کا مکمل ڈاٹا ہے، مگر لوگ اس سے واقف تک نہیں چہ جائیکہ اس کا بھرپور تعاون کیا جاتا۔

اس وقت ملک میں ان واقعات کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے کیونکہ فاشزم کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے، جب مصنوعی قسم کی دیش بھکتی تھوپی جانے لگے اور ہر گلی نکڑ پر وطن پرستی کے ثبوت مانگے جانے لگیں، جب کھلے عام چوراہوں پر، مجمع عام میں اور قانون کے رکھوالوں کے ذریعہ انسانی حقوق کی پامالی کی جانے لگے، جب ذرائع ابلاغ اپنا فرض بھول جائیں بلکہ ان کو ملک کی حکمراں جماعت خرید لے اور من پسند پروپیگنڈوں کے لیے استعمال کرے، جب ایوان حکومت میں مذہبی نعروں کی بھرمار ہو، سیکولر ملک میں مذہب وحکومت کو خلط ملط کیا جانے لگے، جب تعمیری سوچ اور روشن خیالی کی جائز حدود کو پامال کیا جائے اور اس کی تحقیر حکومتی سطح پر کی جانے لگے تو سمجھ لینا چاہیے کہ فاشزم اپنا کام مکمل کر رہا ہے، اس صورت حال میں بھی اگر قوم طاقتور دفاع کے لیے اقدامی پوزیشن میں نہیں آتی تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ مٹنے کے لیے تیار ہے، ذرا غور کیجئے آج بھی لوگ کانگریس کے غم میں مبتلا ہیں جبکہ وہ اپنے وجود کو بچانے کی فکر میں لگی ہوئی ہے، مدھیہ پردیش اور راجستھان میں اس کی حکومت کا کردار سامنے ہے، اور پھر دونوں میں یعنی کانگریس و بھاجپا میں کچھ خاص فرق بھی نہیں، ایک نے انتہائی مہذب انداز میں مسلمانوں کا قتل کیا ہے دوسرا ذرا ذلت کے ساتھ مار رہا ہے، ایک سے ہم نے ہمیشہ دوستی کا دم بھرا ہے اور اسے سیکولر قرار دیا ہے، دوسرے سے دشمنی کو شعار بنایا ہے اور کمیونل قرار دیا ہے۔ ۲۰۱۴ء کے بعد سے اب تک ہم کئی بار کہہ چکے ہیں کہ سمندر میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہیں کیا جاتا، اس سے پہلے کہ ہم کو نفسیاتی طور پر بالکل مجبور بنا دیا جائے، بے بسی کے احساس میں مبتلا کر دیا جائے، ہماری ملی تنظیموں کو آگے بڑھ کر حکومت وقت اور حکمراں جماعت سے ملی مسائل پر اس طرح گفتگو کرنی ہوگی جیسے ملک کے اول درجہ کے شہری کرتے ہیں، نفسیاتی شکست کا عالم یہ ہے کہ ایک داعی قوم جس کے پاس خدا کے آخری اور آفاقی پیغام کی امانت موجود ہے، اس کے چند ایک افراد کو چھوڑ کر جس سے ملئے وہ حالات کا رونا روتا نظر آئے گا اور بی جے پی اس کے سامنے ایک ڈراؤنے بھوت کی شکل میں کھڑی نظر آئے گی، جب آپ پوچھیں گے اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے ہمارے پاس کیا فارمولا ہے تو جواب آئیں بائیں شائیں ہوگا، زیادہ سے زیادہ دعاؤں کی تلقین ہوگی، قانون الٰہی میں محض دعاؤں پر فیصلے نہیں ہوتے، جہد وعمل اور صحیح منہج پر محنت کے ساتھ دعاؤں کو قبولیت عطا ہوتی ہے، اس امت کے پاس بہترین موقع تھا کہ کچھ نہیں تو وہ محض دعوتی نقطۂ نظر سے آگے بڑھ بڑھ کر ملتی اور انسانی بنیادوں پر مسائل کو اٹھاتی، مگر افسوس کہ اب بھی کوئی منصوبہ بندی اور صحیح راہِ عمل اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں۔

اس الیکشن کے بعد جب وزیر اعظم نے اپنے خطاب میں کہا تھا کہ پہلے ہمارا نعرہ تھا ''سب کا ساتھ، سب کا وِکاس'' اور اب ہم اس میں ''سب کا وشواش'' کا اضافہ کرتے ہیں، تو راقم سطور نے سوشل سائٹس پر لکھا تھا کہ اب مسلم قیادت کی ذمہ داری ہے کہ وہ جب بھی کوئی واردات اس نعرے کے خلاف ہو تو وزیر اعظم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کرے اور پوچھے کہ یہ نعرہ بھی

''جملہ'' تھا یا اس کی حقیقت یہی ہے جو ہمیں ان وارداتوں کی صورت میں نظر آ رہی ہے، آخر کیوں ایسا نہ ہوا؟ اس وقت کے سب سے نازک اور حساس مسئلہ موب لنچنگ کے خلاف ہماری تنظیموں نے منظّم احتجاج کیوں نہ کیا؟ متحدہ محاذ کیوں نہیں بنایا؟ حکومت وقت سے سوال کیوں نہیں کیا؟ ایک پلیٹ فارم پر آ کر سر جوڑ کر کیوں نہیں بیٹھے؟ یاد رکھیے یہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں، یہ افراد ملت کو احساسِ شکست میں مبتلا کرنے اور نفسیاتی طور پر مرعوب و دہشت زدہ کرنے کی ایک منظّم سازش و کوشش ہے ورنہ یوں ویڈیو بنا بنا کر وائرل نہ کی جاتی، حکومت ان کو روکنے کے لیے کوئی اقدام نہ کرتی، اس نفسیاتی جنگ میں کہیں نہ کہیں ہم بھی شریک ہو جاتے ہیں اور ان کے ویڈیوز کو ان سے زیادہ ہم وائرل کرتے ہیں، جس سے ان کا کام آسان ہوتا ہے اور ہماری مشکلوں میں اضافہ ہوتا ہے، ہمارے پڑھے لکھے طبقے میں پتہ نہیں کب یہ شعور پیدا ہوگا کہ وہ یہ سمجھ سکے، کس خبر کے پیچھے پڑنا ہے، کس خبر پر کان نہیں دھرنا ہے، کس کو وائرل کرنے میں فائدہ ہے اور کس سے اعراض کرنے میں نفع، غیر تعلیم یافتہ لوگوں سے تو شکوہ ہی نہیں۔

اس سلسلے میں کرنے کے جو کام تھے وہ کچھ بلکہ بڑے پیمانے پر اس تنظیم نے کیا جس کا ذکر اوپر آیا، کچھ اور نوجوانوں نے مل کر اپنی نو وارد تنظیم کے ذریعہ بھی کچھ کام انجام دیا، جھارکھنڈ کے حالیہ واقعہ کے بعد بڑے پیمانے پر ملک بھر میں احتجاج ہوئے، مسلمانوں کو بھی اپنی جان کی فکر لاحق ہوئی، ملت نے پہلی مرتبہ موب لنچنگ کو اپنا مسئلہ سمجھ کر ملک کے سامنے پیش کیا، اس میں بڑا کردار اس ٹویٹر ٹرینڈ کا رہا جو India against lynch terror # کے، لیش ٹیگ کے ساتھ چلایا گیا، جس کی صدائے بازگشت الحمدللہ پورے ملک میں سنی گئی، جس کے بعد سرکردہ شخصیات نے بھی تشویش کا اظہار کیا، اس کا سب سے زیادہ فائدہ یہ ہوا کہ لوگوں میں احساس جاگا، گرتے ہوئے مورال کو سہارا ملا، لوگوں میں حرارت پیدا ہوئی، مورال ایسا بڑھا کہ بعض تند و تیز اور مناسب حال بیانات بھی آئے، ایسے مواقع پر ضرورت ہوتی ہے کہ خدا کے بھروسہ پر حالات کا مقابلہ کرنے کی نفسیات کو فروغ دیا جائے نہ کہ خوف و دہشت اور مرعوبیت کا احساس عام کیا جائے، یہ سب کچھ ہوا مگر ابھی بھی کام بہت باقی ہے، کیونکہ ابھی یہ ساری کارروائی اس قدر مؤثر نہ ہو سکی ہے جس سے یہ سلسلہ رک جائے، ضرورت ہے کہ بھیڑ کی غنڈہ گردی کے خلاف کل جماعتی احتجاج ہو، تمام بڑی تنظیمیں ملک کی راجدھانی کو احتجاج سے بھر دیں، اس گھناؤنے جرم کو عالمی عدالت میں دہشت گردی کی ایک قسم کے طور پر پیش کریں، میڈیا آپ کے موقف کو نہیں پیش کرے گا کیونکہ وہ فاشزم کا آلۂ کار بن چکا ہے، آپ سوشل میڈیا کے ذریعہ اپنی قوم میں یہ احساس پیدا کریں کہ حالات کا مقابلہ کرنا ہے، مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانا ہے، جب جان پر بن آئے تو آسانی سے لقمہ تر نہیں بننا ہے بلکہ مقابلہ کر کے شہادت حاصل کرنا ہے، آپ لوگوں میں یہ شعور پیدا کریں کہ جس علاقہ میں ایسی واردات رونما ہو اس علاقہ کے لوگ کھڑے ہو کر تماشا نہ دیکھیں بلکہ اس بھیڑ پر قابو پانے کے لیے اقدام کریں، مجرموں کی شناخت کر کے ان کو عدالتوں تک کھینچنے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں، ابھی حالات اس قدر خراب نہیں ہوئے ہیں کہ ان پر قابو نہ پایا جا سکے، ابھی وقت ہے کہ پوری شفافیت اور ایمانداری اور جرأت کے ساتھ قوم کو دفاعی پوزیشن سے نکال کر اس پوزیشن میں لایا جائے کہ اس کے اندر ظالم سے سوال پوچھنے کی جرأت پیدا ہو سکے، لیکن اگر اب بھی پالیسی نہ بدلی گئی، طریقۂ کار نہ بدلا گیا، اپنی اپنی سوچ اور اپنے اپنے

طریقہ کار کو ہی فلاح و کامرانی کا ذریعہ سمجھنے کی رٹ نہ چھوڑی گئی اور ایسے حساس مسائل پر بھی متحدہ اور طاقتور آواز نہ بلند کی گئی تو یقین جانیے قومی سوچ کو احساس شکست میں تبدیل ہونے سے کوئی نہ بچا سکے گا، راقم سطور کو دیوبند میں اس سلسلے کے ایک بڑے پروگرام سے مخاطب ہونے کا موقع ملا تو راقم سطور کے پیش نظر قرآن کی جو رہنمائی تھی اس میں ان حالات میں اس مسئلہ سے نمٹنے کے لیے بہت کچھ رہنمائیاں ہیں، ارشاد الٰہی ہے:

يَـاَيُّهَـا الَّـذِيْـنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْراً لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْن، وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَلَا تَـنَـازَعُـوْا فَتَـفْشَـلُـوْا وَ تَـذْهَـبَ رِيْـحُكُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ، وَلَا تَكُوْنُوا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ. (سورہ انفال ۴۵-۴۷)

(اے ایمان والو! جب تمہاری کسی گروہ سے مڈبھیڑ ہو، تو ثابت قدم رہو۔ اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو تا کہ فلاح یاب ہو۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرتے رہو۔ اور جھگڑا نہ کرو، ورنہ پسپا ہو جاؤ گے (اور ناکام ہو جاؤ گے) اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اور صبر کرو (یعنی مضبوطی سے مقابلہ میں ڈٹے رہو) اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، اور ان لوگوں کی طرح مت ہو، جو اپنے علاقوں سے طاقت و دولت کے نشہ میں نکلے اور لوگوں کے سامنے مظاہرہ کرتے ہوئے اور اللہ کے راستہ سے روکتے ہوئے (یعنی تکبر و غرور اور گھمنڈ میں مبتلا مت ہونا اور کوئی غلط اقدام مت کرنا) اور اللہ نے کافروں کے کرتوتوں کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔)

ہاں آخری بات جو عرض کرنا ہے وہ یہ کہ دفاعی سوچ اور دفاعی پالیسی کے ساتھ قوموں کا زندہ رہنا ممکن نہیں ہوتا، ترقی و عروج تو دور کی بات، وجود و تشخص پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے، عہد مکی میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اقدامی سوچ اور اقدامی عمل کی تلقین کی گئی تھی، کبھی آپ کو یا ایها المدثر قم فانذر کا فرمان سنایا گیا، کبھی و جاهدهم به جهادا كبيرا کی شکل میں لائحہ عمل دیا گیا، کبھی یٰا ایها الرسول بلغ ما انزل إليک من ربک وإن لم تفعل فما بلغت رسالته والله يعصمک من الناس إن الله لا يهدی القوم الكٰفرين. (اے پیغمبر آپ کی طرف پروردگار کی طرف سے جو نازل کیا گیا ہے اسے (لوگوں تک) پہنچا دیجئے، اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو پیغمبری کا حق ادا نہیں کیا، اللہ آپ کی لوگوں سے حفاظت فرمائے گا، بیشک اللہ کافروں اور منکروں کو توفیق ہدایت نہیں دیتا۔) کے اسلوب میں خطاب کر کے تحریک و عمل اور اقدام پر آمادہ کیا گیا۔

اس سلسلہ میں علماء اور اہل مدارس کے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ ہر ہر علاقہ میں بہانے تلاش کر غیر مسلموں سے تعلقات بڑھائیں، ضلع انتظامیہ اور شہر انتظامیہ کو اپنے پروگراموں میں مدعو کریں، کچھ نہ کریں، بس صرف انھیں بلا کر محض سو پچاس روپے کا ایک Momento for peace دے دیں، ان کے ساتھ بیٹھیں، بات کریں، دوریاں ختم کریں یا کم کریں، Communication Gape جس قدر کم ہوگا اسی قدر غلط فہمیاں دور ہوں گی، عام ہندوؤں کے ذہن میں زہر گھول دیا گیا، عام مسلمانوں سے نفرت ان کو مذہبی عبادت کے طور پر سکھا دی گئی ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ ان سے ملیں، ان کو بلائیں، ان سے مذہبی رواداری کے موضوع پر گفتگو کریں، انسانی قدروں کو موضوع بنائیں، ہزاروں برس سے ساتھ رہ رہے ان بندگان

خدا تک دعوتِ توحید پہنچانا ہماری ذمہ داری تھی، نہیں پہنچایا تو سزا یقینی ہے، ان حالات میں یکبارگی دعوت کا کام بھی ممکن نہیں، مگر آپ کی دعوتیں، آپ کے پروگرام، آپ کا ساتھ اٹھنا بیٹھنا، آپ کی گفت وشنید اور آپ کی منصوبہ بندی خاموش دعوت اور خاموش انقلاب کی تمہید ہوسکتی ہے، سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہندو اور مسلمانوں اور خاص طور پر مسلمانوں کے مذہبی طبقے اور عام ہندوؤں کے درمیان بڑی دوریاں ہیں، اسی دوری کے سبب عام ہندو ہمارے مذہبی طبقہ کو تیسری دنیا کی خطرناک مخلوق سمجھتا ہے، ضرورت ہے کہ ہم اپنی روش بدلیں، اپنی شناخت کرائیں، اپنی حقیقت سے واقف کرائیں، یہ سب کرنے کے لیے اپنے آپ کو علمی وفکری طور پر تیار کرنا ہوگا، اپنے خول سے باہر نکلا پڑے گا، اپنی سوچ بدلنا پڑے گا، اپنے دائرہ کار کو وسیع کرنا پڑے گا، اگر بار بار اس کی رٹ لگائی جاتی ہے کہ آر ایس ایس ملک سے مسلمانوں کا نام ونشان مٹانا چاہتی ہے، وہ اس ملک کو اسپین بنانا چاہتی ہے، تو پھر ضروری ہے کہ خطرے کے ادراک کے بعد اس کے مقابلہ کے لیے منصوبہ بندی کی جائے، آر ایس ایس سے ڈائیلاگ کی صورت نکالی جائے، ان کی سنی جائے اور اپنی سنائی جائے، اپنی سنانا تو یوں بھی ہمارا فرض منصبی ہے، خطرے کا ادراک ہونے کے بعد بھی غفلت برتی گئی تو سزا دوہری ہوگی، اب گرتی ہوئی دیواروں کے سایہ میں پناہ لینا یا ان کو سہارا دینا عقلمندی نہ ہوگی، اب تو ضرورت ہے کہ دشمن سے بات کی جائے، اس نے نفرت کی جو دیواریں کھڑی کردی ہیں انھیں منہدم کرکے میدان عمل میں سرگرم ہوا جائے، اس ملک اپنی نسلوں کے تحفظ کے لیے اب یہ سب کرنا ضروری ہے، اس کام کو بڑے پیمانے پر کرنے کی ضرورت ہے، یقین مانیے اگر علماء اور اہل مدارس اس کو اپنے منصوبے کا حصہ بنالیں تو سال دوسال میں اس کے فائدے سامنے ہوں گے، نفرتوں اور غلط فہمیوں کا گراف یکسر نیچے آجائے گا، ورنہ ان جلسوں سے کچھ حاصل نہیں جو یکجہتی کے نام پر ہوتے ہیں اور کرایے کے لوگ ان میں نعت پڑھ کر چلے جاتے ہیں، نہ ان سے عام ہندو کی سوچ بدلتی ہے اور نہ ہلکی پھلکی رفاہی خدمات اس سطح پر موثر ہیں جس سطح پر سوچ بدلنے کے لیے کام کرنے کی ضرورت ہے، ضرورت ہے کہ ہم گھلیں ملیں اور ہندوؤں کو دعوتی نقطۂ نظر سے اپنے عملی پروگراموں کا حصہ بنائیں، مدرسہ کے پروگراموں، عام مذہبی جلسوں میں سوچ سمجھ کر موضوعات کا انتخاب کریں اور مسلمانوں کے بقدر غیر مسلموں کو شریک کریں، انھیں دعوتوں کے بہانے اپنی تقریب کا حصہ بنائیں اور برین واش، ذہنی تشکیل کی مہم پر لگ جائیں، جب تک ذہن کی صفائی کا یہ عمل بڑے پیمانے پر نہ کیا گیا تب تک تمام تر اقدامات کے باوجود ہم کسی اطمینان بخش نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتے، یہی وہ راستہ ہے جس کے ذریعہ پرامن فضا قائم ہوسکتی ہے اور قوم میں اقدامی فکر پیدا کی جاسکتی ہے، جس میں زندگی کی نوید ہے، مستقبل کی روشنی ہے، ترقی کا راز ہے اور قائدانہ کردار تک پہنچنے کے امکانات ہیں، اخلاص کے ساتھ عمل کرنا ہمارا فریضہ ہے، عمل میں تاثیر پیدا کرنا اللہ کا کام ہے اور اللہ کا فرمان ہے: إنَّ اللّٰه لا يُضِيعُ أجر المُحْسِنين.

(ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی)

❑ قند مکرر

عیدالاضحیٰ کا پیغام

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

عیدالاضحیٰ آتی ہے اور گذر جاتی ہے، اس بار بھی آئی اور گذر گئی، کچھ خوش نصیب لوگوں نے اس کے لئے بڑا اہتمام کیا ہوگا، کچھ لبرل لوگوں کے لئے یہ ایک رسم رہی ہوگی جو ادا ہوگئی، کچھ کو اس کی تاریخ سے واقفیت رہی ہوگی، اس لیے انھوں نے بڑے خلوص و جذبۂ شکر کے ساتھ قربانی پیش کی ہوگی، کچھ نے گوشت کھانے کے لئے ہی قربانی کی ہوگی، مگر کی تو ہوگی خواہ دکھانے کے لئے ہی کی ہو، جی ہاں! کچھ بے چارے کئی کئی جانور قربان کرتے ہیں اور تعداد مع قیمت خوب بیان کرتے ہیں مگر ان کے غریب اعزہ و اقربا ایک ایک بوٹی کو ترستے ہیں، خیر اب تو نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ کچھ لبرل قربانی کو ہی بے سود اور فضول سمجھنے لگے ہیں، ان کی نظر میں اس قدر خون بہانے سے بہتر ہے کہ یہ رقم صدقہ کی جائے، تعلیم پر خرچ کی جائے اور دوسرے قومی و رفاہی کام کیے جائیں، ظاہر ہے کہ یہ بے چارے عقل مند بلکہ عقل کے مارے جس طرح قربانی کے سماجی و اقتصادی فوائد اور رفاہی پہلو سے واقف نہیں اسی طرح ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ قربانی کے دنوں میں اللہ کو خون بہانے سے زیادہ کوئی اور عمل پسند ہی نہیں، حضور اکرمؐ کا ارشاد ہے: عن عائشةؓ أن رسول الله ﷺ قال: ما عمل آدميّ من عمل يوم النحر أحب إلى الله من إهراق الدم، إنه ليأتي يوم القيامة بقرونها وأشعارها وأظلافها وإن الدم ليقع من الله بمكان قبل أن يقع من الأرض، فطيبوا بها نفساً (رواہ الترمذی، ۱۴۹۳، أبواب الأضاحی) (ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے ارشاد فرمایا: یوم النحر کو ابن آدم کا کوئی بھی عمل خون بہانے سے زیادہ اللہ کے نزدیک محبوب نہیں، اور قربانی کا جانور اپنے سینگ، کھر، اور بالوں کے ساتھ قیامت کے دن آئے گا، اور بے شک وہ خون کے زمین پر گرنے سے پہلے اللہ کے یہاں مرتبہ حاصل کر لیتا ہے، پس اس کو خوش دلی سے انجام دو)۔

حقیقت میں یہ قربانی بندے کے لئے اللہ سے تعلق کے اظہار کا ذریعہ اور اس کی علامت ہے، اس کے خون اور گوشت سے خدا کو کوئی سروکار نہیں، اس کی بارگاہ میں تو وہی تعلق، وہی اخلاص اور وہی نیت پہنچتی ہے جس کے اظہار کے لیے یہ قربانی پیش کی جاتی ہے، اسی کا ارشاد ہے لن ينال الله لحومها ولا دماءها ولكن يناله التقوى منكم (حج: ۳۷) (ترجمہ: اللہ تک ان جانوروں کا نہ خون پہنچتا ہے اور نہ گوشت، اللہ تک تو تمہارا تقوی پہونچتا ہے (اللہ کے یہاں تمہارے خلوص اور تقوی کی اصل قدر ہے)۔

یہ قربانی ایک ایسے قرآنی قصہ کی یادگار ہے جو امتحان وآزمائش کی اعلیٰ ترین مثال ہے، اس میں حکم الٰہی کے سامنے دونبیوں کے سرِ تسلیم خم کرنے کی ایسی مثال بیان کی گئی ہے، ان کے صبر واستقامت اور طاعت الٰہی کا ایسا واقعہ سنایا گیا ہے جو خالق کائنات کو کچھ اس طرح بھایا کہ اسے رہتی دنیا تک کے لیے یادگار بنا دیا، امت اسلامیہ کے ایک فرد کی حیثیت سے ضروری ہے کہ اپنے جد امجد حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے اس واقعہ سے واقفیت حاصل کی جائے، ملت ابراہیمی کی طرف نسبت ہے تو اس نسبت کی اہمیت کو سمجھا جائے، یہ قربانی بھی تو ملت ابراہیمی کا شعار ہے، اسی ملت ابراہیمی کی اتباع کا حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب حضرت محمدؐ کو حکم دیا تھا ثم اوحینا إليك أن اتبع ملة ابراهيم حنيفا وما كان من المشركين (النحل:۱۲۳) (ترجمہ: پھر ہم نے تمہیں پیغام دیا کہ اللہ کے لئے یکسو ہوکر ابراہیم کی ملت کی پیروی کرو، اور ان کی طرز حیات کو اختیار کرو، وہ شرک کرنے والے نہیں تھے)، اس ملت ابراہیمی سے اعراض کرنے والے کو اللہ تعالیٰ نے احمق و بے وقوف قرار دیا تھا، ومن يرغب عن ملة إبراهيم إلا من سفه نفسه ولقد اصطفيناه في الدنيا وإنه في الآخرة لمن الصالحين (بقرہ:۱۳۰) (ترجمہ: ابراہیم کی ملت اور ان کے طور وطریق سے اعراض کرنے والا وہی ہوسکتا ہے جو خود اپنے تئیں احمق وسفیہ ہو، ہم نے دنیا میں ان کا انتخاب کیا، اور آخرت میں وہ ان لوگوں میں ہوں گے، جنہوں نے بالکل درست روش اختیار کی)، اسی ملت ابراہیمی کے اتباع کو اللہ نے حسن اسلام اور غایتِ تدین کی علامت بنایا تھا ومن احسن دينا ممن أسلم وجهه لله وهو محسن واتبع ملة ابراهيم حنيفا وماكان من المشركين (نساء:۱۲۵)، (ترجمہ: اس سے بڑھ کر بہتر دینداری کس کی ہے؟ جو اپنے کو نیکوکاری کے ساتھ اللہ کے حوالہ کردے، اور ملت ابراہیمی کا اتباع کرے، جو اللہ کے لئے یکسو تھے، اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا خلیل (اپنا محبّ ومحبوب) بنایا)۔ اسی ملت ابراہیمی کی طرف اللہ نے اپنے نبی کو ہدایت دی تھی قل إنني هداني ربي الى صراط مستقيم دينا قيما ملة ابراهيم حنيفا وما كان من المشركين (انعام:۱۶۱) (ترجمہ: کہہ دیجئے کہ میرے رب نے صحیح راستے کی طرف میری رہنمائی کی ہے، صحیح دین، صحیح نظام اطاعت اور ملت ابراہیمی کی جو مکمل طور پر اللہ کے لئے یکسو تھے، اور وہ شرک کرنے والے نہیں تھے)، اسی ملت ابراہیمی کے اتباع کا سب کو حکم دیا تھا قل صدق الله فاتبعوا ملة ابراهيم حنيفا وما كان من المشركين (آل عمران:۹۵) (ترجمہ: کہہ دیجئے کہ اللہ نے سچ کہا؛ ابراہیم کی ملت کا اتباع کرو، وہ اللہ کے لئے یکسو تھے، وہ مشرکوں میں سے نہیں تھے)۔ چنانچہ جب یہ قربانی اس ملت ابراہیمی کا شعار ہے تو پھر لازم ہے کہ اس کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کی جائے، اور یہ بھی نہ ہو کہ قربانی تو کی جائے مگر اس کے مقاصد، اس سے حاصل ہونے والے سبق کو فراموش کر دیا جائے، خود عید کے مقاصد سے ہی نابلد رہا جائے، قربانی تو کی جائے مگر قربانی کے علاوہ بقیہ شعبہائے زندگی میں ملت ابراہیمی کے اتباع کو بالائے طاق رکھ دیا جائے اور موقف ابراہیمی کے خلاف زندگی گذاری جائے،

شعائر اسلامی کی پامالی پر دل بھی نہ دکھے، زبان سے آہ بھی نہ نکلے، کفر وشرک سے اظہار براءت اس کے غلبہ اور اس کی ہمنوائی کرنے والوں کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت بھی نہ ہوسکے، ملت ابراہیمی سے نسبت کا تقاضا ہے کہ حضرت ابراہیم کا وہ کردار جوایثار، جرأت، حکمت وبے باکی وحق گوئی اور ببانگ دہل توحید باری کے اعلان سے عبارت ہے ہمارے سامنے ہو۔

عید درحقیقت اسلام میں اجتماعیت اور اسلامی تشخص کی علامت اور مظہر ہے، مسلمانوں کی عیدان کو دوسری قوموں سے ممتاز کرتی ہے، وہ ایک عید بطور شکرانۂ الٰہی مناتے ہیں تو دوسری عید میں بارگاہ الٰہی میں قربانیوں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں، انھیں اس کی قطعاً اجازت نہیں کہ وہ عید کی خوشی میں حدود شریعت سے باہر نکل جائیں، فسق وفجور کی محفلیں سجائیں، جوئے اور ناچ گانے میں مست ہو جائیں، لباس، خوشی اور عید کی پارٹی کے نام پر بے حیائی، فحاشی اور مغربی تہذیب کی نقالی سے عید کے تشخص کو برباد کردیں، کیوں کہ ان کی عید دوسروں کی عید سے ممتاز، مغائر، ممیّز، پاکیزہ، سنجیدہ وباوقار اور بہت بہتر ہے، جیسا کہ خود نبی کریمؐ نے اہل مدینہ سے فرمایا تھا کہ تمہارے یہ جو دو دن کھیل کود کے لیے مختص ہیں، ان کو اللہ نے یوم الفطر اور یوم الاضحیٰ سے تبدیل کردیا ہے جو ان دونوں سے بہتر ہیں، "قدم رسول اللہ ﷺ المدينة ولهم يومان يلعبون فيهما، فقال: ما هذان اليومان؟ قالوا: كنا نلعب فيهما في الجاهلية، فقال رسول الله ﷺ إن الله قد أبدلكم بهما خيرا منهما يوم الاضحى ويوم الفطر۔

اس حیثیت سے یہ بات سمجھنا چاہیے کہ مسلمانوں کی عید دین کا مظہر ہے، دین کا شعار ہے، اس کی تعظیم و احترام لازم ہے، عید میں بھی شعائر دین کی تعظیم کا لحاظ رکھنے، اجتماعی بنیادوں کو استوار کرنے اور اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ عید درحقیقت اپنے دینی تصور کے اعتبار سے محض شکرانۂ نعمت اور شکر الٰہی کا مظہر ہے ولتكملوا العدة ولتكبروا الله على ما هداكم ولعلكم تشكرون (بقرہ:۱۸۵) (ترجمہ: اور یہ مقصود ہے کہ تم روزوں کی تعداد پوری کرو، اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو ہدایت دی ہے اس پر عظمت وکبریائی کے گن گاؤ اور تاکہ تم (اس کی نوازشوں کا) شکر ادا کرو)۔

عید کے اجتماعی، معاشرتی اور انسانی پہلو کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہے، بچوں کو عید کا انتظار رہتا ہے، عید کی آمد سے وہ کھل اٹھتے ہیں، یہ درحقیقت ان کی خوشی کا دن ہوتا ہے، فقراء ومساکین عید کا انتظار کرتے ہیں، ان کو اصحاب ثروت کی طرف سے کچھ مدد مل جاتی ہے، اب اگر بڑے بچوں کی خوشی کا لحاظ نہ کریں، اغنیاء وفقراء کی طرف توجہ نہ کریں تو گویا عید کا یہ پہلو ان کے سامنے نہیں تھا یا پھر عید کا یہ سبق وہ بھول گئے، عید اتفاق واتحاد پیدا کرنے، ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے، رشتوں کی شیرازہ بندی کرنے، عفوودرگذر کا مظاہرہ کرنے، بغض وحسد سے نجات پانے اور نفرتوں کو الفتوں میں تبدیل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے، عید کی انسانی اور اجتماعی حیثیت اس ناحیہ سے بہت اہم ہے، کہ عید کے دن اغنیاء طبقہ وخیرات، ہدایا وتحائف اور قربانی کے گوشت کے ذریعہ اپنے اموال سے فقراء کو دینے کا سبق یاد کریں،

معاشرے کے کمزوروں پر شفقت ومحبت ورحمت کی نگاہ ڈالیں اور کیا خوب ہو کہ مالدار کمزوروں کے ساتھ اس طرح پیش آئیں جیسے اللہ نے ان پر نوازشات کی بارش کی ہے، جیسے اللہ نے ان کو دولت سے مالا مال کیا ہے، نعمتوں سے نہال کیا ہے، اللہ نے اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: أحسن كما أحسن الله إليك ولا تبغي الفساد في الارض إن الله لا يحب المفسدين (سورہ قصص:۷۷) (ترجمہ: اچھا معاملہ کرو جیسے اللہ نے تمہارے ساتھ اچھا معاملہ کر رکھا ہے اور زمین میں بگاڑ نہ پیدا کرو، اور اللہ تعالیٰ فساد اور بگاڑ پیدا کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)، اگر عید کے اس انسانی پہلو کو عمل میں لایا جائے تو عید کی خوشی سے ہر گھر سرشار ہوگا، ہر خاندان عید کا لطف لے گا اور اس طرح اسلامی عبادات کا انسانی واجتماعی پہلو غیروں کے سامنے آکر ان کے لیے باعث کشش اور خاموش دعوت ہوگا۔

عید پر اس پہلو سے بھی غور کیجئے، قرآن مجید کا بیان ہے إن هذه امتكم امة واحدة وأنا ربكم فاعبدون (انبیاء:۹۲) (ترجمہ: یہ تمہاری امت ایک امت ہے، اور میں تمہارا رب ہوں، پس میری بندگی کرو)، ذرا دیکھیے کہ عید کے دن پوری امت مسلمہ کس طرح امت واحدہ ہونے کا شعوری یا غیر شعوری طور پر پیغام دیتی ہے، کس طرح سب ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں، گِلے شکوے دور کرتے ہیں، ایک دوسرے کو کثرت سے ہدایا دیتے ہیں، اس موقع پر بسا اوقات ہدایا کا تبادلہ کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ اپنی ہی چیز گھوم پھر کر واپس آجاتی ہے، اخلاص کی جس قدر فضیلت آئی ہے اس کی مٹھاس بڑی حد تک اس دن محسوس ہوتی ہے، یوں تو بے شمار فضیلتوں کے باوجود پڑوسیوں کے حقوق پر توجہ نہیں دی جاتی مگر عید کے دن پڑوسیت کی حِس بھی جاگ جاتی ہے، یہ الگ بات کہ بعض بدنصیب شہر ایسے بھی ہیں جہاں مسلمان اس دن بھی سات دروازوں میں کنڈی لگا کر گھر کے دربے میں بند رہتے ہیں، اس قدر اندر بیٹھ کر وہ دوسروں سے ملنے کے بجائے لوگوں کی آمد کا انتظار کرتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ اگر عید کے اس پہلو پر شعوری طور پر عمل کیا جائے تو پوری امت انعام الٰہی کا مصداق ٹھہرے گی، کیوں کہ سب کے سب امت کی اجتماعیت کو قائم کرنے میں اپنا حصہ ڈالیں گے، افراد ملت میں اجتماعیت کا احساس پیدا کرنے میں اپنا کردار ادا کریں گے إنما المؤمنون اخوة کی تعبیر وتفسیر عملا پیش کرنے کی کوشش میں شامل ہوں گے، اگر یہ کام کیا جائے اور شعوری طور پر کیا جائے تو یہ بڑے پیمانے پر اصلاح ذات البین کا بھی ذریعہ بن سکتا ہے، معاشرے میں اخوت ومحبت کی جڑیں مضبوط کر سکتا ہے اور بڑے پیمانے پر مؤثر انداز میں اس پیغام کو اس طرح عام کیا جاسکتا ہے، انما المؤمنون اخوة فاصلحوا بين اخويكم واتقوا الله لعلكم ترحمون (الحجرات:(۱۰) (ترجمہ: تمام ایمان والے بھائی بھائی ہیں، اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرایا کرو، اور اللہ کا لحاظ رکھا کرو (اس کی شریعت کی پابندی کیا کرو) تاکہ تم پر وہ رحم فرمائے۔

جب اخوت اسلامی کا یہ احساس پیدا کیا جائے گا تو پھر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ دوسروں کے درد کو محسوس کریں گے، دوسروں کی تکلیف سے انھیں تکلیف محسوس ہوگی، پھر وہ

خود کو فرد ملت سمجھیں گے اور ملت پر ٹوٹنے والے آلام و مصائب کو عید کی خوشی اور دعوتوں کی لذت اور کباب وقورمہ کی کشش میں فراموش نہیں کریں گے، اس امت کو اللہ نے خیر امت بنایا ہے، امت وسط بنایا ہے، اس لیے اس کے ہر کام میں خیر نمایاں اور اعتدال کا اظہار ہونا ضروری ہے، اس امت کے اہل ایمان کی خصوصیت جناب رسالت مآب ﷺ نے یوں بیان فرمائی ہے مثل المؤمنين في توادهم وتراحمهم وتعاطفهم كمثل الجسد الواحد، إذا اشتكى منه عضو واحد تداعى له سائر الجسد بالسهر والحمى۔

(مسند احمد/۱۸۳۷۳، الطبعۃ الاولی ۱۹۹۹ء)

(ترجمہ: آپسی محبت و ہمدردی اور شفقت میں مؤمنین کی مثال ایک جسم کی طرح ہے، کہ جب جسم کے کسی ایک عضو کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو پورا بدن بے خوابی اور بخار کا شکار ہوتا ہے) اس امت کے خیر امت اور امت وسط ہونے کے اعتبار سے لازم ہے کہ خوشی وغمی، تنگ حالی وخوش حالی، مصیبت وفرحت کا کوئی موقع ہو مگر اس کا اعتدال نمایاں ہو کر سامنے آئے، ایک طرف اگر عید کے موقع پر عید کی خوشیوں سے لطف اندوز ہو تو دوسری طرف محروم دنیا کو خوشی میں شریک کرے، اور نظر فلسطین وشام اور دیگر مسلم ممالک کے مظلوم ومقہور و بے بس مسلمانوں کی محرومی پر رکھے اور زبان سے ان کے لیے دعا کرے کہ اللہ ان کے مصائب دور کردے اور آئندہ عید ہماری طرح ان کے لیے بھی خوشیوں بھرا پیغام لے کر آئے۔

عیدیں آتی ہیں گذر جاتی ہیں، اسی طرح اس مرتبہ بھی عید قرباں آئی اور گذر گئی، مگر سوچنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہم نے اس کے پیغام کو سمجھا، کیا عید ہمارے لیے شعور کی بیداری، جذبۂ اخوت ومحبت کو جنم دینے کا ذریعہ بنی، کیا ہماری عید اس طرح مظہر اعتدال ووسطیت بن سکی کہ ہم اپنی خوشی کا اظہار بھی کریں اور دوسرے بھائیوں پر مظالم ومصائب کو بھی محسوس کر سکیں، کیا ہم نے معاشرے کے کمزوروں کو اپنے دسترخوان پر بلایا، کیا ہم ان کی حوصلہ افزائی کے لیے ان سے ملنے گئے، کیا ہم نے غریبوں کی مدد کی، ان کے گھر بھی اچھا کھانا پک جائے، اس کی فکر کی، گھر کے نوکر کے بچے بھی نئے کپڑے پہن لیں اور ہمارے بچوں کی طرح خوشی منالیں، یہ احساس جاگا، کیا ہمارے اندر ابراہیم واسمعیل علیہما السلام کی ملت کے اتباع کا احساس جاگا، کیا ان کے صبر واطاعت واستقامت اور راہ خدا میں حکم الٰہی کے سامنے اپنی ہر چیز قربان کر دینے کے واقعہ سے ہمارے اندر بھی اطاعت واستقامت کا کچھ جذبہ پیدا ہوا، یا یہ عید بھی گوشت کھانے پکانے اور قربانی کے جانور کے محفل در محفل تذکرے کرنے میں گزر گئی، اگر اب تک ہم نے غور نہیں کیا ہے، قربانی کی حقیقت، عید کے پیغام محبت و اجتماعیت اور اس کے معاشرتی وانسانی پہلو کو نہیں سمجھ سکے ہیں تو پھر ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ آئندہ عید آنے سے قبل ہم اپنے اور اپنے اہل خانہ کے اندر یہ روح پیدا کرلیں، تاکہ آئندہ ہماری صحیح معنی میں عید ہو سکے اور ہم انفرادی طور پر عبادت کرنے کے ساتھ ساتھ اجتماعی احساس کو فروغ دینے اور مقاصد عید کو عام کرنے کا ذریعہ بن جائیں۔

☆☆☆

❑ پیام سیرت

جبلِ اُحد کی صدائے بازگشت

محمد فرید حبیب ندوی

''کون ہے جو مجھ سے ان کے حملوں کو دور کرے اور جنت کا پروانہ حاصل کرے؟''

(من یدفعھم عنی و لہ الجنۃ)

تصور کے مرکب پہ سوار ہوکے، ذرا چودہ صدی کا سفر طے کیجیے۔

آپ کو اس پکار کی گونج سنائی دے گی۔

اللہ کا ایک بندہ.....لاڈلا اور پیارا بندہ.....نبی ورسول بندہ..... یہ صدا لگا رہا ہے۔

احد کا میدان ہے.....معرکۂ کارزار گرم ہے.....اللہ کے دشمنوں نے اللہ کے بندے کو گھیر لیا ہے۔

وہ تاک تاک کر اس کی ذات کو نشانہ بنا رہے ہیں۔

ان کے ارادے دیکھ کر لگتا ہے جیسے وہ آج اسے ختم کر کے ہی سانس لیں گے۔

خدا بھی یہ تماشا دیکھ رہا ہے۔

وہ اگر چاہے تو فرشتے بھیج کر اپنے حبیب کی جان بچا سکتا ہے۔

وہ اگر چاہے تو فوج دشمن کو تتر بتر کر سکتا ہے۔

لیکن نہیں.....آج اسے اپنے حبیب کے جیبوں کا امتحان لینا ہے۔

آج وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اس کی ناموسِ رسالت کی حفاظت کے لیے کون آگے بڑھتا ہے۔

وہ جانچنا چاہتا ہے کہ اس نے اپنے محبوب کو جن لوگوں کے حوالے کیا ہے، وہ رسمِ مہر و وفا کس طرح نبھاتے ہیں؟

خدا پھر کیا دیکھتا ہے کہ مسکرانے لگتا ہے۔

وہ دیکھتا ہے کہ اس کے محبوب کی حفاظت کے لیے ایک نہیں.....کئی کئی ہاتھ آگے بڑھے ہیں۔

ایک گردن نہیں.....دسیوں گردنیں اس کے بچاؤ میں قربان ہونے کے لیے خم ہیں۔

''اے آقا! آپ اپنا سر نہ اٹھائیے.....کہیں آپ کو تیر نہ لگ جائے.....دشمن کے تیروں کے لیے میرا سینہ حاضر ہے''۔

ایک جاں نثار اپنی جان کا نذرانہ یوں پیش کرتا ہے۔

یہ کون ہے، جس پر ملائکہ کے سامنے خدائے پاک اظہار فخر کر رہا ہے۔

یہ کون ہے جو رسولِ خدا کے لیے سپر بن گیا ہے.....اور اب.....سارے تیر اس کی پیٹھ کو چھلنی کیے دے رہے ہیں.....اوہ! یہ ابو دجانہؓ ہیں۔

اور یہ کون ہے.....جو اِن نوکیلے تیروں کو اپنے کفِ دست سے روک رہا ہے ..... جس کا سارا ہاتھ چھلنی ہوگیا ہے.....بالآخر وہ کٹ کر زمین پر گر گیا ہے۔

یہ جاں نثار وفدا کار صحابی طلحہؓ ہیں.....جو آج ناموسِ رسالت کی حفاظت کے لیے اپنی ہتھیلی پر جان کا نذرانہ لیے بارگاہِ رسول میں حاضر ہیں۔

''کون ہے جو اِن کے حملوں سے مجھے بچائے.....''۔

یہ صدا احد کے میدان میں اٹھ رہی ہے..... اور..... جاں نثار اپنی جانوں کو طشت میں سجا کر آقائے نامدار کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

ارے یہ کون ہے؟.....جس کے بارے میں رسول خدا حکم دیتے ہیں کہ ان کے نیم مردہ بدن کو میرے قریب لاؤ.....آپ نے محبت سے اس کا سر اپنی گود میں رکھنا چاہا.....لیکن اس نے آپ کے قدموں پر اپنا منہ رکھ دیا، اور اسی حالت میں روح پرواز کر گئی..... آہ! زیاد بن سکن! تو کتنا مبارک ہے!.....دنیا کے سب سے مقدس قدموں پر جان دینے کی سعادت تیرے حصے میں آئی۔.....ہائے کاش! .....بدن میں ہزار جانیں ہوتیں اور ہر بار یہ سعادت حاصل ہوتی۔خدا تجھے مبارک کرے.....۔

اے ابودجانہ وطلحہ وزیاد بن سکن .....اور اے جماعتِ انصار! تمہارا شکریہ.....تمھیں سلام .....کہ تم نے امت کے بارے میں خدائے ذوالجلال کے گمان کو غلط نہیں ہونے دیا..... اے گروہِ صحابہ! پوری امت تمہاری مقروض و نیاز مند ہے۔

لوگو!..... یہ صدا رسولِ پاک نے چودہ سو سال پہلے لگائی تھی۔

تم کیا سمجھتے ہو کہ صرف یہ میدانِ احد کے تیروں سے بچنے کے لیے تھی؟

کیا تمھیں اس کی بازگشت سنائی نہیں دیتی؟

ذرا کان تو لگاؤ.....آج بھی یہ صدا اُسی شان سے آرہی ہے۔

جو گوشِ دل سے سنو گے، تو اس کی گونج آج بھی سنائی دے گی۔

آج ایک میدانِ اُحد نہیں..... ہر طرف اُحد ہی اُحد ہے۔

آج بھی رسول اللہ ﷺ اُسی شان سے اپنے امتیوں کو آواز لگا رہے ہیں۔

آج جسم کو لہو کرنے والے تیر نہیں تو کیا ہوا.....آپ کے لائے ہوئے پیام کو چھلنی والے تیر تو ہر چہار جانب برس رہے ہیں۔

آج آپ کی ذات اقدس نشانہ نہیں تو کیا ہوا.....آپ کی سیرت .....آپ کی شریعت.....آپ کی تعلیم اور آپ کا دین تو زد پر ہے۔

کہیں خدا کا انکار ہے.....کہیں شریعت کی ترمیم و تنسیخ کے نعرے ہیں.....کہیں انکار حدیث و وحدتِ ادیان کے فتنے ہیں.....کہیں ختم نبوت پہ حملے ہیں..... یہ سارے زہر آلود تیر ہیں، جو آج بھی اُسی قوت سے برس رہے ہیں، جس قوت سے احد کے میدان میں برس رہے تھے۔

ہاتھ وہی ہیں، بس چہرے بدل گیے ہیں.....مقصد بھی وہی ہے، بس انداز بدل گیے ہیں۔

آج پھر امت کا امتحان ہے.....خدا دیکھنا چاہتا ہے کہ کتنے ہاتھ.....کتنے قلم.....اور .....کتنی زبانیں ان تیروں کو روکنے کے لیے آگے بڑھتی ہیں۔

اے لوگو!..... آگے بڑھو..... اور اپنی زبان و قلم سے جنت کا ٹکٹ خرید لو۔

مگر ہائے افسوس! یہ پکار صدا بصحرا ثابت ہو رہی ہے۔

.....ناموسِ رسالت حملوں کی زد میں ہے اور امت غافل ہے۔

اے جماعت طلبہ وعلما! کیا بات کہ آج تم میں..... ابودجانہ وطلحہ وزیاد.....ایک بھی نہیں۔

تمھیں کیا ہوا کہ تمھارے ہاتھ حفاظتِ حق کے لیے آگے نہیں بڑھتے۔

تم کیسے غافل ہو.....صدا سنتے ہو، پھر بھی مدہوش ہو۔

حملوں کی بوچھار دیکھتے ہو، پھر بھی خاموش ہو۔

تیروں کی بارش برس رہی ہے، پھر بھی تم دادِ عیش دے رہے ہو۔

ابوطلحہ کا جذبۂ حفاظتِ رسول، ابودجانہ کی خم زدہ پیٹھ، طلحہ کا دستِ شل اور زیاد کا سرِ مبارک .....تمھیں دعوتِ عمل دے رہا ہے.....کیا تم میں کوئی ہے، جو اِس صدا پہ لبیک کہنے کو تیار ہو؟

☆☆☆

❑ عالم اسلام

تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں!

(شہید ملت حافظ ڈاکٹر محمد مرسی کا سیاسی قتل)

(۱۹۵۱ء—۲۰۱۹ء)

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

تحریک اخوان المسلمون کے قیام سے لے کر تا دمِ تحریر اس کی تاریخ بے مثال قربانیوں اور تاریخ ساز کارناموں سے عبارت ہے، جمال عبد الناصر، انور السادات اور حسنی مبارک جیسے لوگوں نے اس تحریک کو ختم کرنے کی اپنی سی ہر ممکن کوشش کر لی مگر وہ ناکام رہے، اس تحریک کو جس قدر دبایا گیا، کچلا گیا، نوچا گیا، لوٹا گیا، ہر مرتبہ اسی قدر یہ شاداب ہوکر، طاقت ور بن کر پوری قوت کے ساتھ سامنے آئی، اسی کشمکش میں اس تحریک کے اسلام سے مضبوط تر رشتہ کا راز پوشیدہ ہے، ظالموں نے بانیٔ تحریک امام حسن البنا شہید کو اپنی گولیوں سے بھون دیا تھا اور پھر کسی کو ان کے جنازے میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دی تھی بجز ان کے والد اور گھر کی خواتین کے، تو یہ سمجھا تھا کہ اب مصر سے اخوان کے جاں نثاروں کا خاتمہ ہو جائے گا، لیکن افسوس کہ یہ بے چارے اس قرآنی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہے جس کو حسن البنا کے ہزاروں شاگردوں اور جان نثاروں نے حرزِ جاں بنالیا تھا **من المؤمنين رجال صدقوا ما عاهدوا الله عليه فمنهم من قضى نحبه و منهم من ينتظر وما بدلوا تبديلا** (احزاب ۲۳) (ایمان میں بہت سے مرد مؤمن تھے جنھوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا اسے سچ کر دکھایا، ان میں سے وہ بھی تھے جنھوں نے اپنی مدتِ حیات پوری کر لی اور وہ بھی ہیں جو (شہادت کے) انتظار میں ہیں، اور انھوں نے کوئی ردو بدل نہیں کیا)، چنانچہ بانی کی شہادت کے بعد تحریک مزید قوت کے ساتھ ابھری، ایک سے بڑھ کر ایک جیالے اور متوالے اس تحریک سے وابستہ ہو کر اپنی قربانیاں پیش کرتے رہے، مصر کے طاغوتوں نے اخوانی اخبارات و رسائل پر پابندی عائد کی، اخوانی کارکنان کو پابند سلاسل کیا، قید و بند کی ایسی صعوبتوں سے دوچار کیا جس کی مثال اسپین میں مسلمانوں کے خاتمہ کے لیے استعمال ہونے والے قید خانے اور وہاں کیے جانے والے مظالم بھی نہیں پیش کر سکتے، عقوبت و ایذا رسانی کے اعتبار سے مصری جیلیں دنیا کی بدترین اور بدنام زمانہ جیل ہیں، اس کی کچھ جھلکیاں اخوانیوں کے ذریعہ لکھی گئی زنداں کے شب و روز کی سرگذشتوں میں دیکھی جا سکتی ہیں، اخوانیوں کے ادارے تباہ کیے، ان کے جگر گوشوں کو ان کی آنکھوں کے سامنے شہید کیا، ان کی املاک تباہ و برباد کی گئی، مگر شیدائیان اسلام نے قرآن کے اس حصے کی عملی تصویر پیش کی جس حصہ میں اہل حق کی صبر آزما قربانیوں، ان کی ثبات قدمی اور احقاق حق کی کوششوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، ظالم سمجھ رہے تھے کہ تحریک دم توڑ دے گی اور مصر کے صحراؤں میں دفن ہو جائے گی، مگر ظالموں کی نظر قرآن مجید میں بیان کی گئی

ایام اللہ کی تاریخ پر نہیں گئی، وہ تو تحریک کو مصر میں ہی ختم کر دینا چاہتے تھے مگر تحریک کی جڑیں تو پوری دنیا میں پھیلتی چلی گئیں، مختلف ملکوں میں اس کی شاخیں قائم ہوتی چلی گئیں، عالمِ عربی میں بیشتر پڑھے لکھے لوگ اور بالخصوص علوم اسلامیہ سے وابستہ افراد اخوان سے وابستہ رہے۔

فرعون نے موسیٰ کے دنیا میں نہ آنے کے لیے کیا کچھ نہ کیا؟ مگر قدرت نے موسیٰ کی پرورش فرعون کے محل میں ہی کرائی، پھر انھیں ملک چھوڑنا پڑا مگر قدرت نے انھیں انقلاب مصر کا ذریعہ بنایا، بنی اسرائیل کی فرعون کے ہاتھوں ذلت کو ایسی عظمتوں سے تبدیل کر دیا جس کو قرآن نے **و فضلنکم علی العالمین** سے تعبیر کیا، حضرت یوسف کو کنویں میں ڈالا گیا، وہاں سے اللہ نے انھیں حاکم مصر کے گھر پہنچا دیا، پھر انھیں پاکدامنی اور بے قصوری کے باوجود جیل کاٹنی پڑی مگر قدرت نے انھیں جیل سے نکال کر وزیر خزانہ اور پھر مصر کا حاکم بنا دیا، خود ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تحریکِ ایمانی کو ختم کرنے کے لیے کون کون سی سازشیں نہ رچی گئیں؟ قریش مکہ کی کوششیں، یہود کی سازشیں، منافقین کی تمنائیں سب تاریخ کا حصہ رہیں، ہر جنگ میں یہود ومنافقین بس یہی پروپیگنڈہ کرتے تھے کہ اب کہ بار اسلام کی آواز میدان جنگ میں ہی دفن ہو جائے گی مگر قدرت باری کو کچھ اور ہی منظور تھا وہاں تو فیصلہ ہو چکا تھا **لیظھرہ علی الدین کلہ** کا خواہ کفار ومشرکین لاکھ چیں بہ جبیں ہوں اور لاکھ تیوری بھوں چڑھائیں اور تلملائیں، یہ وہ تاریخی حقائق ہیں جن کو یا تو ظالموں نے اچھی طرح سمجھ رکھا ہے اسی لیے وہ فرعونی اندازِ ظلم کو دوہرا رہے ہیں، اس دور کے یہود سازشوں میں ویسے ہی شریک ہو رہے ہیں جیسے مدینہ کے یہود شرکت کرتے تھے اور اس دور کے منافقین ویسے ہی بغلیں بجا رہے ہیں جیسے مدینہ کے منافقین مسلمانوں کے خاتمہ کے متعلق تمناؤں کا اظہار کرتے تھے، ان کے حوصلوں کو پست کرنے والے پروپیگنڈے کرتے تھے، یا پھر ظالموں سے سمجھنے میں غلطی ہو رہی ہے اور وہ ایام اللہ کی قرآنی تاریخ سے واقف نہیں ہیں، اگرچہ اس کا امکان بہت کم ہے۔

بہر حال اخوان کی قربانی کا جو سلسلہ حسن البنا شہید سے شروع ہوا تھا، وہ سید قطب، عبدالقادر عودہ سے ہوتے ہوئے مہدی عاکف اور مصری تاریخ کے پہلے منتخب صدر محمد مرسی تک آ پہنچا، صدر محمد مرسی کی تجہیز وتکفین کے موقع پر بانی تحریک کی یاد تازہ ہوگئی مگر ساتھ ہی حقیقتِ حال کا علم بھی ہو گیا اور باطل کے خوف کا اندازہ بھی، ملعون زمانہ غاصبِ مصر سیسی کے ظالمانہ رویہ کے سبب صدر مصر محمد مرسی شہید کے جنازے میں کسی کو شرکت کی اجازت نہ تھی بجز ان کے وکیل اور دو بیٹوں کے، ترکی کے صدر رجب طیب اردوغان نے خوب تبصرہ کیا کہ ''سیسی اس قدر بزدل ہے کہ محمد المرسی کی نعش سے بھی ڈر رہا ہے''، یہ تو بہت مشہور بات ہے کہ ظالم وغاصب بزدل ہوا کرتا ہے، سیسی نے اپنے اس عمل سے اس حقیقت کو مزید واضح کر دیا، وہ بے چارہ سمجھ رہا تھا کہ اس طرح وہ محمد مرسی کو بے نام ونشان کر دے گا لیکن عقل کے مارے کو یہ نہیں معلوم کہ مرسی جیسے لوگ ایوان حکومت میں نہیں دلوں میں بسیرا کرتے ہیں، چنانچہ مرسی کی شہادت کی خبر سن کر پوری دنیا ماتم کدہ بن گئی، جگہ جگہ اس طرح تعزیتی جلسے ہوئے جیسے لوگوں کا کوئی قریبی عزیز چلا گیا ہو، لوگ آپس میں ایک دوسرے کی اس طرح تعزیت کرنے لگے جیسے سب اپنا ذاتی غم بانٹنا چاہتے ہوں، اہل غزہ اور اہل فلسطین سراپا ماتم بن گئے، مسجد اقصیٰ میں سب سے پہلے ان کی غائبانہ

نماز جنازہ ادا کی گئی، مراکش سے انڈونیشیا تک اور برصغیر سے یورپ وافریقہ اور امریکہ تک ہر جگہ دعاؤں کا اہتمام ہوا اور نماز جنازہ ادا کی گئی، گویا مرسی کا انتقال تحریک اخوان کو نئی زندگی دے گیا، ان کی شہادت نشانِ عزیمت اور پیامِ انقلاب بن گئی، مصر کی تاریخ میں کوئی دن نہیں جب کہ غاصبوں کے خلاف احتجاج نہ ہوتا ہو، اگر چہ میڈیا حکومتی تسلط کے سبب ان کو چھپاتا ہے، سیسی کو اگر انقلاب کا خوف نہ ہوتا تو وہ محمد مرسی کے جنازے پر پابندی نہ لگاتا، یہ بذات خود اس کی واضح دلیل ہے کہ وہ ہتھیار کے بل پر حکمراں بن کر مسلط ہے، اس میں عوام کی کوئی دلچسپی نہیں، یقین جانیے وہ بھی اسی طرح نشان عبرت بنے گا جیسے فرعون مصر بنا، وہ بھی ایسے ہی بے نام ونشان ہوگا جیسے شاہ عبداللہ کا حال ہوا جس نے اخوان کی منتخب حکومت کا تختہ الٹنے کی خاطر مصری فوج کے لیے دولت کے دہانے کھول دیے تھے، اس کے دنیا سے گئے ہوئے چند دن نہیں بیتے تھے کہ اس کے متعلقین تک کو بڑی بے دردی اور بے عزتی سے بے دخل کر دیا گیا، حال یہ ہوا کہ آج کوئی نام لیوا تک نہیں، جو نام لیتا بھی ہے تو ملامتوں کو ساتھ ملا دیتا ہے۔

اس مضمون میں مرسی کی سوانح اور ان کی خدمات کو قلم بند کرنا مقصود نہیں، اس پہلو سے کئی مضامین آ چکے، یہاں دراصل ان کی شہادت، ان کی اہمیت اور اس فکر کا تذکرہ مقصود ہے جس کا وہ تسلسل تھے جس فکر سے مخالفین و معاندینِ اسلام اور منافقینِ امت کو خطرہ لاحق ہے، محمد المرسی ایک حافظ قرآن، عالم دین، جدید تعلیم یافتہ، امریکی یونیورسٹی میں شعبۂ انجینئرنگ کے استاد ومحقق اور مصری تاریخ کے رمزِ انقلاب تھے، وہ اس تحریک کے عملی طور پر نمائندہ تھے جس تحریک نے عربی اور اسلامی معاشرے میں دن کے رکبان اور رات کے رہبان پیدا کیے، جس تحریک نے فرنگی تخیلات، باطل نظریات سے عرب نوجوانوں کو نجات دلائی، جس نے کمیونزم، سوشلزم اور کیپٹلزم کے سیلاب کا مقابلہ کیا، جس نے اسلام پر اعتماد کو بحال کیا، جس نے عرب معاشرے میں وہ ماحول تشکیل دیا جس ماحول میں علماء ربانیین کا استقبال کیا گیا، اسلامی مفکرین کا لٹریچر پڑھا گیا، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور مولانا محمد الحسنیؒ جیسے نامور اصحاب قلم کی پذیرائی جو لوگ عالم عربی میں کر رہے تھے وہ سب اخوانی تھے، ان کی تحریروں کو جو لوگ سینوں میں بسا رہے تھے اور آنکھوں سے لگا رہے تھے، ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین کی انقلابی فکر سے جو اپنی نسلوں کو تیار کر رہے تھے وہ سب اخوانی تھے، جس زمانے میں عالم عربی میں ان شخصیات اور ان جیسے بزرگوں کی پذیرائی ہو رہی تھی وہ زمانہ اخوان کی پذیرائی اور اخوان کے اثر ورسوخ کا زمانہ تھا، خلیجی جامعات میں ہر طرف اسی تحریک کے نمائندوں کا چرچا تھا، مشاہیر وقت اسی تحریک سے وابستہ تھے، رابطہ ادب اسلامی سے منسلک بیشتر چوٹی کے ادباء اسی فکر کی نمائندگی کرتے تھے، خود سعودی حکومت فکر اخوان کی آبیاری کر رہی تھی، اسلامی نظام کے نفاذ کی آواز بلند کرنے والوں کو اکرام واعزاز کے طمغے دے رہی تھی، مولانا مودودی کی ''الجہاد فی الاسلام'' کو وزارت اوقاف شائع کر رہی تھی، ''ماذا خسر'' حدیث المجالس بنی ہوئی تھی، یہ وہ تحریک تھی جس نے مکمل اسلام کی تصویر پیش کی تھی، جس نے دعوت وسیاست، ذکر وفکر، علم و زہد، قناعت وصنعت، جہد و جہاد، اوراد و وظائف اور کسبِ معاش، عبادات ومعاملات واخلاقیات کا حسین مرکب پیش کیا تھا، جس نے عملی طور پر مغرب کی پیدا کردہ دین ودنیا کی تقسیم کو کالعدم ثابت کر دیا تھا، شہید محمد المرسی اس کی جیتی جاگتی

تصویر تھے، وہ عابد وزاہد تھے، وہ مجاہد تھے، وہ قرآن کے شیدائی اور عالم باعمل تھے، وہ بلاشبہ جدید تعلیم یافتہ تھے مگر اسلامی تعلیمات کا رنگ ان پر غالب تھا، ان کے متعلق شہادت دی گئی کہ جب تک وہ امریکہ میں تھے، وہ اور ان کی اہلیہ فجر سے بہت پہلے مسجد پہنچتے، مسجد کی صفائی کرتے، تہجد پڑھتے حتی کہ فجر کا وقت ہو جاتا، یہ ان کا روزمرہ کا معمول تھا، یہ جان کر حیرت ہوگی کہ انھوں نے صدارتی محل کے بجائے کرایے کے فلیٹ میں قیام کیا، اپنی مدت صدارت میں انھوں نے اپنے لیے اور اپنے اقربا کے لیے سرکاری مراعات حاصل کرنے سے کلی اجتناب کیا، وہ اپنی ذاتی زندگی میں بہت پرسکون تھے مگر ان کی مجاہدانہ تربیت نے انھیں سیاست میں آکر ملک وملت کی خدمت کے لیے مجبور کیا، انھوں نے پوری مدت صدارت میں اپنی منظور و متعین تنخواہ کا ایک روپیہ بھی نہیں لیا، ان کی عظمت اس میں تھی کہ وہ طاغوت کے سامنے جھکے نہیں، وہ چاہتے تو بغاوت کے وقت کامیابی سے فرار ہو جاتے، وہ چاہتے تو سیاسی پناہ حاصل کر لیتے، وہ چاہتے تو اپنی سابقہ زندگی میں واپس چلے جاتے لیکن پھر داستان عزیمت و جہاد کون رقم کرتا، پھر دلوں کو ایمان کی حرارت و تازگی کون بخشتا، پھر طاغوتی محلوں کے کنگورے کس کے رعب سے لرزتے، پھر پوری دنیا میں کس کے جنازے کی دھوم ہوتی، پھر فرش سے عرش تک کس جانے والے کا ذکر خیر ہوتا، پھر ملکوں ملکوں کس کے لیے سرکاری سطح پر سوگ کا اعلان کیا جاتا، مرسی کی عظمت دیکھنی ہے تو ان کے اہل خانہ کو دیکھنا چاہیے۔ عام طور پر بڑے لوگ اپنے اہل خانہ کی تربیت نہیں کر پاتے مگر محمد مرسی کی اہلیہ اور ان کے صاحبزادے نے ثابت کر دیا کہ محمد مرسی انھیں بھی راہِ عزیمت کا مسافر بنا گئے، اہلیہ نے کہا کہ میں لنچ کے لیے درخواست دے کر اپنے شوہر کو شرمندہ نہیں کروں گی، بیٹے نے کہا ابّا اب ہم اللہ کے یہاں آپ سے ملیں گے۔

محمد مرسی کو شامی خاتون اہل قلم عبیر النحاس نے شہیدِ ملت قرار دیا، ان کو کمزوروں اور بے کسوں کا مسیحا قرار دیا، ان کے مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ شامی اور فلسطینی کاز کے لیے مرسی کس قدر اہمیت کے حامل تھے، شام وفلسطین میں ان کی موت پر صف ماتم کیوں بچھ گئی، انھوں نے صحیح لکھا ہے کہ مرسی نے قوم وملک کے لیے اپنے ذاتی آرام، اپنی شخصیت اور اپنی عزت نفس کو قربان کر دیا، مرسی دنیاوی زندگی میں کامیاب ترین انسان تھے، شجاعت و پامردی ان کی صفت تھی، جہدِ مسلسل اور عمل پیہم کا پیکر تھے، اپنی انا اور اپنی ذات کے انکار اور دوسروں کے لیے جینے اور کام کرنے میں وہ قابل تقلید نمونہ تھے، اپنے ہدف کو حاصل کرنے کے لیے اپنی اور اپنے مستقبل کی قربانی دینا ان سے سیکھنا چاہیے، بلند اخلاقی اور تواضع وکسر نفسی کا ان سے سبق لینا چاہیے، مرسی کے ہمنواؤں کو ان سے شکوہ رہا کہ وہ بہت زیادہ نرم مزاج اور رحم دل ہیں، لوگوں کا خیال ہے کہ ان کی ضرورت سے زیادہ رحمدلی اور نرم روی نے ان کو نقصان پہنچایا، وہ صرف کمزوروں، معذوروں اور مسکینوں کے لیے ہی شفیق نہ تھے بلکہ اپنے مخالفین ومعاندین کے لئے بھی ان کا معاملہ شفقت ومحبت آمیز تھا، محمد مرسی کی کامیاب زندگی کا سلسلہ بعد از وفات بھی جاری رہا، لوگوں نے دنیا کے تمام براعظموں میں ان کی وفات پر مظاہرے کیے، ان کی موت کو سیاسی قتل قرار دے کر انھیں شہید کہا، ان کی نماز جنازہ جگہ جگہ ادا کی گئی، بے شمار لوگوں نے مرسی کے لیے عمرہ کیا، سعودی حکومت نے قوی امن وسلامتی کو آڑ بنا کر معتمرین کو یہ تصویریں سوشل سائٹس پر پوسٹ کرنے سے روک دیا۔

یہاں مجھے اس موقع سے دوہرائی جانے والی کئی غلط فہمیوں پر تبصرہ بھی کرنا ہے اور کئی غلط رویوں پر ماتم بھی، عام طور پر لوگ یہ کہتے ہیں کہ اخوان نے سیاست میں حصہ لے کر ٹکراؤ کی پالیسی اختیار کی جو کامیاب حکمتِ عملی نہیں ہے، ویسے بھی ہم کو سیاست کے راستے کو نہیں بلکہ دعوت کے راستے کو اختیار کرنا چاہیے، ہمیں یہ عرض کرنے دیجئے کہ حکمتِ عملی کو ناکام قرار دینے سے قبل ناکامی کے اسباب سے واقف ہونا اور دیانت داری کے ساتھ ان کا اظہار کرنا انتہائی ضروری ہے، ورنہ اپنے موقف کی تائید کے لیے کتمانِ علم بھی لازم آئے گا اور لوگوں کی غلط رہنمائی کا گناہ بھی، اخوان کی ستر سال سے زائد تاریخ دعوت وعزیمت اور ان کی شبانہ روز دعوتی واصلاحی کوششوں کو نظر انداز کر کے کوئی گفتگو نہیں کی جاسکتی اور نہ کوئی حکم لگایا جا سکتا ہے، اخوان کو ناکام قرار دینے کے لیے پہلے ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی ان کی ستر سالہ جہد مسلسل کی تاریخ کا مطالعہ کرنا ہوگا، جس کا بیشتر حصہ عربی میں ہے جس کو پڑھنے اور سمجھنے سے اکثریت قاصر ہے، ابتدا میں اخوان نے سیاست میں حصہ لیا، عوامی مقبولیت کے سبب کامیابی ملی مگر دشمنوں نے شدید نقصان پہنچایا، اخوان سمجھ گئے، سیاست سے کنارہ کش ہوگئے، دعوت واصلاح اور رفاہی خدمات نیز تعلیمی میدان کو اپنا دائرہ عمل بنایا، تقریباً ۶۰ دہائیوں کی محنت کے بعد جب از خود قوم نے انقلاب کا بگل بجایا تو اخوان نے اپنی محنت اور تعمیر فکر کی کوششوں کے نتیجہ میں عوام کے رجحان کی قدر کرتے ہوئے سیاست میں حصہ لیا، عوام نے شفاف انتخابات میں مینڈیٹ دیا، مگر اسلامی نظام کے دشمنوں کو جگہ جگہ اور بار بار ہر شعبہ میں اسلام کی بالادستی کا نعرہ اور اظہارِ عزم کیوں کر برداشت ہوسکتا تھا۔ چنانچہ اعداء اسلام اور منافقین امت نے مل کر اخوانی حکومت کا تختہ الٹ دیا، ہم نے اس وقت (ندائے اعتدال اگست/ستمبر ۲۰۱۳ء کے شمارے میں) تفصیل سے اس کے اسباب پر روشنی ڈالی تھی، دراصل ہمارے اپنے لوگوں کی مجبوری یہ ہے کہ وہ حقائق تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے، سنی سنائی باتوں، سرسری خبروں اور پروپیگنڈوں کی روشنی میں موقف قائم کرتے ہیں، اچھے خاصے دیندار اور فکر اسلامی کے علمبردار بھی سیکولر پروپیگنڈوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور پھر خود ہی لوگوں کے اسلام پر اعتماد کمزور ہونے کا سبب بنتے ہیں، بزدلی کا درس دیتے ہیں اور اسلام پسندوں کو ہی ناکام قرار دے دیتے ہیں، درحقیقت محمد مرسی کے بعض ایسے ''جرائم'' تھے جو دشمنوں اور منافقوں کو ایک آنکھ نہ بھائے، مرسی اقتدار میں آتے ہی عالم اسلام میں اپنے فکر وکردار اور اپنے مشن ووزن کے سبب مرکزیت ومرجعیت حاصل کرنے لگے تھے، ان کی یہ پیش قدمی عالم اسلام کی سربراہی کے ٹھیکیدار سعودی عرب کو کبھی راس نہ آسکتی تھی، جس نے ہمیشہ شیعہ دشمنی کے کھوکھلے نعرے لگا کر امت کو گمراہ کیا ہے، حالانکہ حقیقت اس کے برخلاف ہے، سیاسی مصالح کے تحت اس کی ایران دشمنی دوستی میں بدلتی رہتی ہے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ کبھی اس کے علماء شیعہ مخالف لٹریچر کی بھرمار کر دیتے ہیں اور کبھی ان پر ایسی پابندی لگتی ہے کہ تنقید کے دو بول پر بھی شیخ حذیفی کو معزول کر کے قید کر دیا جاتا ہے، اور علماء پر ایران وشیعہ مخالفت سے اجتناب کا حکم نافذ کر دیا جاتا ہے، کبھی سعودی مارکیٹ میں شیعہ مخالف لٹریچر کی بھرمار ہوتی ہے اور کبھی یکسر غائب، محمد مرسی سے سعودیہ کا مطالبہ تھا کہ وہ ایران کا دورہ نہ کریں، مگر مرسی عالم اسلام کے اتحاد کے داعی تھے، وہ ایران گئے، ان کی ویڈیو شاہد ہے کہ انھوں نے اپنی گفتگو کا آغاز اہل سنت کی شان کے مطابق کیا، انھوں نے دو

دو چار کی طرح دوٹوک گفتگو کی، ایران نے بھی مرسی کی طرف ہاتھ بڑھایا، سعودیہ کو یہ بات راس نہ آئی، قضیہ فلسطین میں سعودیہ خود کو فلسطین کا ٹھیکیدار سمجھتا ہے، اخوانی دور حکومت میں محمد مرسی نے کامیاب ثالثی کی اور اسرائیل کو دفاعی انداز میں مصالحت پر مجبور کیا، اسرائیل پر قابو کرنے کے لیے واشنگٹن پوسٹ نے مرسی کی شخصیت کو سب سے مؤثر و طاقتور قرار دیا، سعودیہ کو یہ کامیابی کیسے راس آتی جو اسرائیل کے شانہ بشانہ بھی رہتا ہے اور فلسطینیوں کی مرہم پٹی کے لیے کچھ امداد دے کر عالم اسلام کا ہیرو بھی بنتا ہے، تازہ مثال دیکھ لیجئے ایک طرف ''صفقۃ القرن'' (Century Deal) کے ذریعہ فلسطین کو فلسطینیوں سے خالی کرانے اور یروشلم کو اسرائیل کی راجدھانی بنانے کی تیاری ہے، دوسری طرف شاہ سلمان ایک ہزار فلسطینی خاندانوں کو سرکاری حج کی دعوت بھی دے رہے ہیں، محمد مرسی کا ایک ''جرم'' یہ بھی تھا کہ انھوں نے شامی انقلاب کی بھرپور حمایت کی تھی، انھوں نے شامی سفارت خانہ کو بند کیا تھا، اس کی دراصل وجہ یہ تھی کہ ترکی اور مصر شام میں ایک آزاد، خود مختار عوامی اور اسلام پسند حکومت کا قیام چاہتے تھے، اردوغان نے مصر کے عوامی انقلاب کی بھرپور حمایت کی تھی اور شام میں بھی وہ عوامی انقلاب کے حامی تھے، مصر میں تبدیلی اقتدار کے وقت ترک صدر عبداللہ گل نے اخوانی مرشد عام سے جا کر ملاقات کی تھی، مصری معیشت کے استحکام کا بیڑا اردوغان نے اٹھایا تھا، مصری معیشت کو سابق حکمرانوں نے اس بری طرح لوٹا تھا کہ عوام کی اکثریت نانِ شبینہ کے لیے لائن لگاتی تھی، پروپیگنڈوں سے پَرے مرسی کے ایک سالہ دور حکومت کا حقیقت پسندانہ مطالعہ کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ ایک سال میں ہی وہ معاشی استحکام کی طرف کس قدر آگے بڑھے تھے، معیشتی خود مختاری کے لیے کیا کیا اقدامات کیے تھے۔ ترکی و مصر اور شام کے مثلث سے جو اسلام پسندوں کا بلاک تشکیل پاتا وہ اس قدر مؤثر و طاقت ور بن سکتا تھا کہ اسرائیل کی زندگی دوبھر ہو جاتی، فلسطینیوں کے حقوق کی بحالی کی راہ آسان ہو جاتی، عالم عربی کی طاغوتی طاقتوں کے طاغوتی ایجنڈوں کی موت ہو جاتی، محمد مرسی کا یہ وہ ''مجرمانہ منصوبہ'' تھا جس نے انھیں قید و بند کی طویل صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد مرتبۂ شہادت سے سرفراز کیا، مصر کے انقلاب کو ناکام کیا گیا، منتخب حکومت کے حصے بخرے کر دیے گئے، شام میں کامیاب پیش قدمی کو ظالمانہ کارروائیوں سے روک دیا گیا اور بالآخر ترکی میں بھی ایک ناکام بغاوت کا تجربہ کیا گیا، اس پوری کارروائی کے دوران سعودیہ و امارات کا کردار انتہائی مجرمانہ اور منافقانہ رہا، (ہم اپنے متعدد مضامین میں وضاحت سے اس بابت لکھ چکے ہیں)۔

غور طلب یہ ہے کہ اخوانی حکومت کا تختہ الٹنے، صدر کو پسِ زنداں ڈالنے، پرامن مظاہرین کو گولیوں کی باڑ پر رکھنے اور بالآخر صدر مرسی کو طبی امداد نہ فراہم کرنے سے لے کر کمرۂ عدالت میں ان کی موت واقع ہونے اور پھر ان کے جنازے پر پابندی لگانے تک کے واقعات پر انسانی حقوق کی عالمی تنظیمیں خاموش رہیں، جمہوریت پر بلڈوزر چلتا رہا اور جمہوریت کے علمبردار اور جمہوریت کے محافظ ادارے ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے اور بغلیں بجاتے رہے، یورپ و امریکہ نے جمہوریت کے دوغلے پن کی خوب دلیلیں فراہم کیں، منتخب صدر کے جنازے میں کسی کو شرکت کی اجازت تک نہ دی گئی، پھر بھی حقوق انسانی کے ٹھیکیداروں کی زبان نہ کھلی، طبی امداد فراہم نہ کیے جانے کا شکوہ خود مرسی نے کیا اور پھر کمرۂ عدالت سے سفر آخرت پر چلے گئے، عالمی ٹھیکیداروں میں ذرا بھی دیانت و

غیرت اور منصفانہ جرأت تھی تو شفاف تحقیقات کراتے، اردوغان نے تو UNO تک کو مخاطب کر کے کہا کہ اگر واقعی ہمت ہے تو عالمی برادری اس سیاسی قتل کی شفاف تحقیقات کرائے، قضیہ شام میں بھی اب تک یہی دوغلا رویّہ سامنے ہے، اس اجمالی تذکرہ کا مقصد یہ ہے کہ ان حقائق سے آنکھیں بند کر کے اخوان کی حکمت عملی کو غلط قرار دینا، اسلام پسندوں کو ناکام بتانا، بلکہ اسلامی نظام کے نفاذ کے نظریہ پر ہی سوال اٹھانا اور سیاست میں شرکت کو غلطی قرار دینا حماقت یا نفسیاتی شکست اور ذہنی خلجان کے سوا کچھ نہیں۔

محمد المرسی کی شہادت کے بعد عالمی پیمانے پر جو ردعمل سامنے آئے وہ انتہائی حوصلہ افزا تھے، اس میں سب سے طاقتور موقف ان لوگوں کا تھا جنھوں نے ان کی موت کو سیاسی قتل قرار دیا اور عالمی اداروں سے آزادانہ اور شفاف تحقیقات کا مطالبہ کیا، مگر عالمی ادارے آزاد ہوتے تب تو لبوں کو جنبش دیتے، سب سے گھناؤنا کردار اس طبقہ کا تھا جو مرسی کی موت پر شہنائیاں بجا رہا تھا، انھیں مشرک قرار دے رہا تھا، ان کی موت کو ''خس کم جہاں پاک'' سے تعبیر کر رہا تھا، ان بیانات کو دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا تھا کہ خدایا تیرے نبیؐ کی یہ آخری امت پستیوں کی اس حد تک پہنچ جائے گی، مسلکی عصبیت اور گروہی دشمنی، مالی منفعت اور حبّ دنیا اسے قعر مذلت کی ان گہرائیوں تک پہنچا دے گی، اس کی تو امید نہ تھی، اگر اس صورت حال پر قابو نہ پایا گیا تو آئندہ اس سے بھی زیادہ خطرناک صورت حال پیش آنے کی توقع کی جا سکتی ہے، اس موقع پر ایک طبقہ وہ بھی رونما ہوا جس کی علمی تنگ نظری اور مسلکی شدت پسندی مشہور زمانہ بن چکی ہے، جس نے اس حساس معاملہ کے بعد جبکہ پورا عالم اسلام تلملا اٹھا تھا، ہر طرف آہ وفغاں تھی، مگر اس طبقہ نے بحث چھیڑ دی کہ مرسی کی اس موت کو ''شہادت'' قرار دیا جا سکتا ہے یا نہیں، نماز جنازہ غائبانہ ادا کی جا سکتی ہے یا نہیں، امت میں فقہی اختلافات عہد صحابہ سے ہی منقول ہیں، مگر یہ طرز عمل جواب دیکھنے میں آ رہا ہے اہل علم کی نظر میں کبھی محبوب نہ رہا، راجح ومرجوح اور افضل ومفضول ہی نہیں بلکہ جواز وعدم جواز کے فقہی اختلافات میں بھی امت کا تعامل مخالفت ومخاصمت اور ایک دوسرے کی تضلیل وتذلیل کا کبھی نہ رہا، ہمیشہ معتدل مزاجی اور تطبیق وتفہیم کا رواج رہا، پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ اگر ان ائمہ مجتہدین (جن کو معیار حق سمجھا جاتا ہے) میں سے کسی کے نزدیک کوئی چیز صحیح وثابت شدہ ہے تو پھر اس کی اس طرح نکیر کرنا گویا وہ قطعاً حرام ہے، اپنے مسلک کو یوں پیش کرنا کہ گویا وہ منزل من اللہ ہے اور دوسرے مسلک کی اس طرح تردید وتحقیر وتنقیص کرنا گویا وہ باطل پر قائم ہے، کس طرح درست رویہ ہوسکتا ہے؟ راقم سطور نے اس موقع پر یہ لکھنے پر اکتفا کیا کہ ''سیسی سے زیادہ قابل رحم وہ بیچارے ہیں جو اس وقت بھی شہادت اور نماز جنازہ سے متعلق مسلکی بحثیں چھیڑے ہوئے ہیں، یقیناً صرف علم دین ضروری نہیں، بلکہ علم دین کے ساتھ فہم دین بھی ضروری ہے، اللہ تعالیٰ علم دین کے ساتھ دین کا فہم بھی عطا کرے''، یقیناً یہ امور بحث وتحقیق کے علمی موضوعات بن سکتے ہیں مگر **لکل مقال مقام** کے اصول سے اہل علم کا واقف ہونا از بس ضروری ہے، جس کا بے حد فقدان نظر آتا ہے۔

بہر حال محمد مرسی کی شہادت ایک سیاسی قتل ہے، ان کا خون آل سعود اور آل نہیان اور سیسی کی گردن پر قرض ہے، ان کے جرائم کی فہرست میں ایک ناقابلِ معافی جرم کا اضافہ ہے، محمد مرسی کا سیاسی قتل عالمی طاقتوں کے فریب اور ناعاقبت اندیش عرب حکمرانوں کی مجرمانہ سیاسی دہشت گردی کا نتیجہ

ہے، خدا ہی ان ظالموں سے نمٹے گا، خدا کی کتاب میں ہر موقع کے لیے بہترین رہنمائیاں موجود ہیں، اس نازک و حساس موقع پر ایک فاضل دوست نے جن آیات کی طرف توجہ مبذول کرائی ان میں لوگوں کے لیے دروس وعبر موجود ہیں، وقت کے فرعونوں، انجام سے غافل ظالموں اور اپنے ظلم کے سبب اللہ کی نظر میں لعنت کے مستحق قرار پائے ملعونوں کے لیے سزاؤں کا اعلان ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلاَ تَحْسَبَنَّ اللّهَ غَافِلاً عَمَّا يَعْمَلُ الظَّالِمُونَ إِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ الأَبْصَارُ، مُهْطِعِينَ مُقْنِعِي رُءُوسِهِمْ لاَ يَرْتَدُّ إِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ وَأَفْئِدَتُهُمْ هَوَاء، وَأَنذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَأْتِيهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُولُ الَّذِينَ ظَلَمُواْ رَبَّنَا أَخِّرْنَا إِلَى أَجَلٍ قَرِيبٍ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ أَوَلَمْ تَكُونُواْ أَقْسَمْتُم مِّن قَبْلُ مَا لَكُم مِّن زَوَال، وَسَكَنتُمْ فِي مَسَاكِنِ الَّذِينَ ظَلَمُواْ أَنفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الأَمْثَال، وَقَدْ مَكَرُواْ مَكْرَهُمْ وَعِندَ اللّهِ مَكْرُهُمْ وَإِن كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ، فَلاَ تَحْسَبَنَّ اللّهَ مُخْلِفَ وَعْدِهِ رُسُلَهُ إِنَّ اللّهَ عَزِيْزٌ ذُو انتِقَامٍ، يَوْمَ تُبَدَّلُ الأَرْضُ غَيْرَ الأَرْضِ وَالسَّمَاوَاتُ وَبَرَزُواْ للّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ، وَتَرَى الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِينَ فِي الأَصْفَادِ، سَرَابِيلُهُم مِّن قَطِرَانٍ وَتَغْشَى وُجُوهَهُمُ النَّارُ، لِيَجْزِيَ اللّهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ إِنَّ اللّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ، هَـذَا بَلاَغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنذَرُواْ بِهِ وَلِيَعْلَمُواْ أَنَّمَا هُوَ إِلَـهٌ وَاحِدٌ وَلِيَذَّكَّرَ أُوْلُواْ الأَلْبَابِ، (ابراھیم ۴۲-۵۲)

(اور یہ مت سمجھنا کہ اللہ ظالموں اور مجرموں کے کرتوتوں سے غافل ہے، ان کو وہ اس دن کے لیے مہلت دے رہا ہے، جب آنکھیں پتھرا جائیں گی، اور مجرم سر اٹھائے سرپٹ دوڑ رہے ہوں گے، کہ پلک جھپکنے کی نوبت نہیں آئے گی، پلٹ کر اپنے کو بھی نہیں دیکھیں گے، اور ان کے دل اڑے جارہے ہوں گے، اور اس دن سے لوگوں کو خبردار کردیجئے جب ان پر عذاب آئے گا، اور ظالم کہیں گے، اے ہمارے مالک! تھوڑی سی ہمیں مہلت دے دیجئے، ہم آپ کی دعوت قبول کرلیں گے، اور رسولوں کی پیروی کریں گے، (جواب میں کہا جائے گا) کہ کیا تم لوگ قسم کھا کھا کر نہیں کہتے تھے کہ تم ٹلنے والے نہیں ہو، تم ان لوگوں کے علاقوں میں رہے جنھوں نے اپنے اوپر ظلم ڈھایا (اپنی قضا بلائی) اور تم نے کھلے بندوں دیکھ لیا کہ ہم نے ان کا کیا حشر کیا، اور تمہارے سامنے مثالیں بھی بیان کیں (اور تمہیں حالات سے مطلع کیا) انھوں نے اپنی چالیں چلیں، اور اللہ کے پاس ان کی چالیں نوٹ تھیں، ان کی سازشیں اور چالیں ایسی تھیں کہ پہاڑ بھی نہ ٹھہر پاتے، تو یہ نہ سمجھنا کہ اللہ اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرتا ہے، اللہ ہی غالب ہے، اور (مجرموں کو) سزا دے کر رہتا ہے، اس دن کے بارے میں سوچو جب زمین یہ زمین نہ رہے گی اور آسمان یہ آسمان نہ رہیں گے، اور سارے (انس وجن) ایک غالب اور زبردست قوت و جبروت والے اللہ کے سامنے ہوں گے، اور تم مجرموں کو اس دن بیڑیوں اور ہتھکڑیوں میں جکڑا دیکھو گے، ان کے کپڑے تارکول کے ہوں گے، اور ان کے چہروں پر آگ چھائی ہوئی ہوگی، تاکہ ہر شخص کو اس کے جرائم کی سزا ملے، بے شک اللہ کے ہاں حساب میں دیر نہیں لگتی، یہ تمام لوگوں کے لئے پیغام ہے، تاکہ وہ خوب آگاہ ہوجائیں اور یہ جان لیں کہ وہ ایک معبود ہے (ایک مالک ہے اور صاحبِ اقتدار ہے) اور تاکہ عقلمند اور دانشمند ہوش میں آئیں اور نصیحت سے فائدہ اٹھائیں۔)

☆☆☆

❑ عالم اسلام

شہید قدسی محمد مرسیؒ

عبدالغفار عزیز

جب سے مصر کے واحد منتخب صدر پروفیسر ڈاکٹر محمد مرسی کی شہادت کی خبر ملی، تو دنیا میں ان کے آخری لمحات کی تفصیل کا انتظار تھا۔ الحمدللہ، شہید کی اہلیہ محترمہ نجلاء محمد مرسی سے فون پر گفتگو ہوئی، اور پھر ان کے صاحبزادے احمد محمد مرسی سے بھی رابطہ ہوا، وہ بتا رہے تھے کہ:

ہمیں والد صاحب کی وفات کے دس گھنٹے بعد جیل میں ان کی میت کے پاس لے جایا گیا اور چہرے پر پڑی چادر ہٹائی گئی، تو ہم سب کو ایک دھچکا لگا، اور چہرے پر شدید تناؤ، غصّے اور بیماری کے اثرات نمایاں تھے۔ ہم نے مغفرت کی دُعائیں کرتے ہوئے، وہاں بڑی تعداد میں موجود فوجی اور پولیس افسروں سے کہا کہ وہ تجہیز و تکفین کے لیے اہل خانہ کو ان کے ساتھ اکیلے چھوڑ دیں، جسے انھوں نے مان لیا۔ اس ربّ کی قسم! جس نے یہ کائنات پیدا کی جیسے ہی جنرل سیسی کے وہ گماشتے کمرے سے نکلے، ہم سب حیران رہ گئے کہ ابّو کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہونا شروع ہوگئے۔ تناؤ کے بجائے سکون اور پیلاہٹ کے بجائے نور طاری ہونے لگا۔ یہ کوئی ابّو کی کرامت نہیں، اللہ کی طرف سے ہم سب کے لیے بشارت اور ڈھارس کا سامان تھا۔ گویا ابّو نے صرف اپنی حیات ہی میں ان جابروں کے سامنے جھکنے سے انکار نہیں کیا تھا، اپنی وفات کے بعد بھی وہ ان کے مظالم پر احتجاج کر رہے تھے''۔

''گذشتہ تین برس سے قید میرے بھائی اسامہ محمد مرسی کو بھی تجہیز و تکفین اور جنازے میں شرکت کے لیے اسی اثناء میں اجازت دے دی گئی۔ ہم نے مل کر ابّو کو غسل دینا شروع کیا، ابّو کے چہرے پر اطمینان اور مسکراہٹ میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ ادھر ہم غسل و کفن دے کر فارغ ہوئے ادھر مؤذن نے فجر کی اذان بلند کی۔ یہ ہمارے لیے ایک اور بشارت تھی، کیونکہ ابّو نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، انھوں نے کبھی فجر کی اذان گھر میں نہیں سنی تھی۔ وہ اذان فجر سے کافی پہلے مسجد چلے جاتے تھے۔ اب وہ گذشتہ چھے سال سے قید تنہائی میں تھے، تو وہاں بھی خود ہی اذان دیتے اور خود ہی اکیلے باآواز بلند نماز ادا کرتے تھے۔ ہم اہل خانہ نے جیل میں باجماعت نماز فجر ادا کی، پھر اکیلے ہی وہیں ان کی نماز جنازہ پڑھی اور سخت فوجی پہرے میں ان کی میت لے کر قبرستان روانہ ہوگئے''۔

''ابّو کی وصیت تھی کہ انھیں ان کے بزرگوں کے ساتھ مصر کے ضلع شرقی کے آبائی گاؤں میں دفن کیا جائے، مگر جنرل سیسی نے اس وصیت پر عمل درآمد کی اجازت نہ دی اور قاہرہ کے مضافات میں واقع النصر شہر کے قبرستان میں تدفین کا حکم سنایا۔ یہاں اللہ نے ہمیں ایک اور بشارت سے نوازا۔ ہم نے

انھیں الاخوان کے سابق مرشد عام محمد مہدی عاکف کے پہلو میں دفن کیا۔ ہم نے ابّو کو قبر میں لٹانے کے بعد آخری بار چہرہ دیکھا، تو اب وہ بلا مبالغہ چودھویں کے چاند کی طرح دمک رہا تھا۔ ابّو کی تدفین کے لیے جیسے ہی مرحوم مرشد عام محمد مہدی عاکف کی قبر کھولی گئی تو اس دن کی آخری بشارت عطا ہوئی (واضح رہے کہ مصر میں قبریں زمین میں کھود کر نہیں، قبروں کے حجم کے چھوٹے کمرے بنا کر اس کے کچے فرش پر میت سپرد خاک کر دی جاتی ہے اور دروازہ اینٹوں سے چُن دیا جاتا ہے)۔ دو سال قبل ابّو ہی کی طرح جیل میں بیماریوں اور حکمرانوں کی سفاکی کا شکار ہو کر جامِ شہادت نوش کر جانے والے مرشد عام کا جسد خاکی، دو سال بعد بھی بالکل اسی طرح تر و تازہ اور کفن اسی طرح اُجلا اور سلامت تھا۔ ابّو کو ان سے خصوصی محبت تھی۔ ابّو سے ہماری آخری ملاقات گذشتہ سال ستمبر میں ہوئی تھی۔ صرف ۲۰ منٹ کی اس ملاقات میں بھی انھوں نے سب سے پہلے مرحوم محمد مہدی عاکف صاحب کی صحت کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ ہم نے جب انھیں بتایا کہ وہ تو تقریباً ایک سال قبل اللہ کو پیارے ہو گئے تو ابّو کو بہت دکھ ہوا۔ وہ ان کے لیے دُعائیں کرتے رہے اور پھر کہنے لگے ان شاء اللہ حوض نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اکٹھے ہوں گے۔ اب اللہ نے دونوں کو قبر میں بھی تا قیامت اکٹھا کر دیا، ان شاء اللہ جنت میں بھی اکٹھے رہیں گے''۔

مصر کے واحد منتخب صدر محمد مرسی کی وفات کے بعد ہر روز ان کی کوئی نہ کوئی نئی خوبی اور نیکی دنیا کے سامنے آ رہی ہے۔ ان کی صاحبزادی شیما نے بھی ایک واقعہ لکھا ہے کہ: ''صدر منتخب ہونے کے بعد وہ اپنے ملک اور اپنی قوم کی عزت و وقار کے بارے میں پہلے سے بھی زیادہ حساس ہو گئے تھے۔ ایک روز نماز جمعہ کے لیے جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اچانک ان کے سیکریٹری کا فون آیا کہ: ''امریکی صدر اوباما کے دفتر سے فون آ رہا ہے، وہ ابھی اسی وقت ۱۰ منٹ کے لیے آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کے دفتر والے بتا رہے ہیں کہ پھر اس کے بعد صدر اوباما کے پاس وقت نہیں ہوگا''۔ صدر محمد مرسی نے کہا: ''انھیں بتا دیں کہ اس وقت میرا اپنے اللہ سے ملاقات کا وقت طے ہے، اس وقت بات نہیں ہو سکتی۔ اگر آج ان کے پاس وقت نہیں ہے، تو میں بھی فارغ ہو کر جب وقت ہوگا انھیں اطلاع کروا دوں گا۔ انھیں یہ بھی بتا دیں کہ یہ رابطہ ۱۰ منٹ نہیں صرف پانچ منٹ کے لیے ہو سکے گا''۔ اتنا کہہ کر ابّو نے فون بند کر دیا۔ میں یہ سن کر اور ابّو کو دیکھ کر ہنس دی، تو وہ کہنے لگے کہ: ''یہ لوگ ہمارے ساتھ غلاموں کی طرح کا سلوک کرتے ہیں۔ اب مصر کو ایک آزاد مسلم ملک کی طرح جینا سیکھنا ہوگا''۔

ایک جانب وہ عالمی طاقت کے سربراہ کے سامنے اس قدر خوددار تھے، تو دوسری جانب اپنے بھائیوں اور عام مسلمانوں کے سامنے اتنے ہی منکسر المزاج۔ اُردن کے ایک شہری کا کہنا ہے کہ: ''صدر محمد مرسی کی شہادت کے وقت میں جرمنی میں تھا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ پھولوں کے ایک چھوٹے سے کھوکھے کے باہر ان کی تصویر آویزاں ہے۔ مجھے تعجب ہوا اور میں کھوکھے کے اندر چلا گیا۔ اندر دیکھا تو اس دکان والے نے صدر مرسی کے ساتھ اپنی کئی اور تصاویر لگائی ہوئی تھیں۔ میں نے تفصیل پوچھی تو اس نے بتایا کہ صدر مرسی جرمنی کی دورے پر آ رہے تھے۔ میں نے آمد سے ایک روز قبل سفارت خانے فون کر کے بتایا کہ میں فلاں کھوکھے کا مالک بول رہا ہوں۔ مصر کا ایک مسیحی ہوں اور صدر مرسی سے ضروری

بات کرنا چاہتا ہوں۔ سفارت خانے والوں نے میرا نمبر لے کر فون بند کر دیا۔ اگلی صبح میں نے دکان کھولی تو اس وقت ششدر رہ گیا کہ صدر مرسی کسی پروٹوکول کے بغیر خود میرے کھوکھے کے باہر کھڑے تھے۔ مجھے لے کر ساتھ والے چائے خانے پر بیٹھ گئے اور پوچھا کہ کیوں یاد کیا تھا؟ میں نے کہا کہ سچی بات یہ ہے کہ آپ کی جیت کے بعد مصر کے قبطی مسیحیوں کے بارے میں تشویش بڑھ گئی ہے۔ کہنے لگے بیرون ملک مقیم ایک مسیحی بھائی کا پیغام ملنے پر میں خود حاضر ہو گیا ہوں تو بھلا مصر کی ۱۰ فی صد مسیحی آبادی کے بارے میں کیسے تساہل برت سکتا ہوں؟ بس اس کے بعد سے صدر محمد مرسی میرے ہیرو ہیں''۔

امریکا میں دورانِ تعلیم ان کے رہایشی علاقے میں رہنے والے ایک سعودی دوست نے بتایا کہ:

''امریکی یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کے بعد انھیں اسی یونی ورسٹی میں تدریس کی شان دار ملازمت مل گئی۔ دورانِ تعلیم اور پھر یونی ورسٹی کے پروفیسر بن جانے کے بعد بھی، وہ اپنی اہلیہ کے ہمراہ نماز فجر سے پہلے مسجد آجاتے تھے۔ میاں بیوی مل کر مسجد کے طہارت خانوں سمیت مسجد کی صفائی کرتے، نماز تہجد پڑھتے اور باجماعت نماز فجر کے بعد گھر واپس جاتے۔ کبھی یہ بھی ہوتا کہ مؤذن یا امام صاحب بروقت نہ پہنچ پاتے تو حافظ قرآن محمد مرسی ہی اذان یا امامت کے فرائض انجام دیتے''۔

شہید صدر کو یہ تواضع اور انکساری اپنے والدین سے حاصل ہوئی تھی۔ تمام اہل قصبہ باہم محبت میں گندھے ہوئے تھے۔ ان کے والد صاحب کا نام محمد تھا۔ اس نام سے انھیں اتنی محبت تھی کہ انھوں نے سب سے بڑے بیٹے کا نام بھی محمد ہی رکھا۔ ان کے تمام ذاتی کاغذات میں اور صدر منتخب ہونے کے اعلان کے وقت بھی جب ان کا مکمل نام پکارا گیا، تو یہی تھا: محمد محمد مرسی عیسٰی العیاط۔ ۱۹۹۵ء اور ۲۰۰۰ء میں ہونے والے انتخابات میں انھوں نے الاخوان المسلمون کی طرف سے حصہ لیا اور حسنی مبارک حکومت کی تمام تر دھاندلی کے باوجود رکن اسمبلی منتخب ہوئے۔ ۲۰۰۵ء کے انتخابات میں پھر حصہ لیا۔ انھیں تمام اُمیدواران میں سب سے زیادہ ووٹ حاصل ہوئے۔ ان کے اور دوسرے نمبر پر آنے والے اُمیدوار کے ووٹوں میں بہت واضح فرق تھا، لیکن حسنی مبارک انتظامیہ نے نتائج تسلیم کرنے کے بجاے، ان کے حلقے میں دوبارہ انتخاب کروا دیے اور پھر ان کے بجاے ان سے ہارنے والے کو کامیاب قرار دے دیا گیا۔ دنیا کے بہترین پارلیمنٹیرین کا اعزاز پانے والے جناب محمد مرسی کا ''جرم'' یہ تھا کہ گذشتہ دو اَدوار میں انھوں نے حکومتی وزرا کی کارکردگی اور ملک میں جاری کرپشن کا کڑا مؤاخذہ کیا تھا۔ انھوں نے ۲۰۰۴ء میں دیگر جماعتوں کے ساتھ مل کر ایک قومی پلیٹ فارم تشکیل دیا۔ جنوری ۲۰۱۱ میں جب مصری عوام کی بے مثال قربانیوں اور جدوجہد کے نتیجے میں حسنی مبارک کا ۳۰ سالہ دور ختم ہوا، تو ڈاکٹر محمد مرسی نے ملک کی ۴۰ دیگر سیاسی جماعتوں کو ساتھ ملاتے ہوئے 'جمہوری اتحاد برائے مصر' تشکیل دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ ۳۰/اپریل ۲۰۱۱ء کو الاخوان المسلمون کی مجلس شوریٰ نے اپنی سیاسی جدوجہد کے لیے 'آزادی اور انصاف پارٹی' کے نام سے الگ جماعت بنانے اور ڈاکٹر محمد مرسی کو اس کا سربراہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس پارٹی نے تمام تر اندرونی و بیرونی سازشوں کے باوجود پارلیمانی انتخابات میں واضح کامیابی حاصل کی۔

ان کی دینی، سیاسی اور پارلیمانی صلاحیتوں کی طرح ان

کی تعلیمی اور تدریسی صلاحیتوں کی شہرت بھی اتنی نمایاں تھی کہ جب ۱۹۸۵ء میں مصر واپس آ کر الزقازیق یونی ورسٹی میں تدریس کی خدمات انجام دینے لگے، تو انھیں کئی عالمی یونی ورسٹیوں اور اداروں نے مشورے اور مختلف تحقیقی منصوبوں میں شرکت کے لیے مدعو کیا۔ خود 'ناسا' نے بھی مختلف تجربات میں انھیں شریک کیا۔ ۳۰ جون ۲۰۱۲ء سے ۳ جولائی ۲۰۱۳ء تک کے اپنے ایک سالہ دورِ اقتدار میں، صدر محمد مرسی کو اصل مقتدر قوتوں کی طرف سے شدید مزاحمت اور سازشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ملک میں اچانک گیس اور تیل کا بحران کھڑا کر دیا گیا۔ یہ مصنوعی بحران پیدا کرنے کے لیے کئی بار یہ ہوا کہ تیل سپلائی کرنے والے ٹینکروں کو صحرا میں لے جا کر ان کا تیل بہا دیا گیا۔ گیس کے سلنڈر اور چینی بڑے بڑے گوداموں میں ذخیرہ کر دی گئی۔ ایک غیر جانب دار تحقیقی ادارے کی جانب سے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق ان کے دورِ اقتدار کے ایک سال کے دوران ان پر تین بار قاتلانہ حملوں کی سازشیں پکڑی گئیں۔ منظّم مخالفانہ ابلاغی مہمات چلائی گئیں۔ پھر جب ان تمام سازشوں کے نتیجے میں مصری تاریخ کے اکلوتے منتخب صدر کا تختہ اُلٹ دیا گیا تو چند گھنٹوں میں لوڈ شیڈنگ، گیس و پٹرول کی فراہمی سمیت سارے مسائل کسی جادوئی چھڑی سے حل ہونے لگے۔ چند نمایاں ممالک کی طرف سے بھی اربوں ڈالر اور مفت تیل کے عطیات کی بارش ہونے لگی۔ یہ الگ بات ہے کہ آج تک اربوں ڈالروں کی جاری بارش کے باوجود مصر مسلسل تباہی اور ناقابلِ بیان اقتصادی بدحالی کا شکار ہے۔

صدر محمد مرسی نے اپنے ایک سالہ دور میں کرپشن، قومی خزانے سے لوٹ مار اور ظلم و جبر کے خاتمے اور بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے وہ بنیادی اقدام اُٹھائے تھے کہ اگر وہ اپنا عہدِ صدارت مکمل کر لیتے تو مصر اس وقت یقیناً ایک جبر و استبداد اور تباہی و بدحالی کی علامت بن جانے کے بجائے آزادی و خوش حالی کی راہ پر گامزن ہو چکا ہوتا۔ یہی ان کا بنیادی جرم تھا۔ لیکن ان کا اصل اور سنگین جرم یہ تھا کہ وہ پڑوس میں واقع سرزمین قبلۂ اول پر صہیونی قبضہ کسی صورت تسلیم کرنے والے نہیں تھے۔ اسرائیلی وزیراعظم نیتن یاہو کا وہ ویڈیو کلپ آپ آج بھی سن سکتے ہیں، جس میں وہ کہہ رہے ہیں کہ: ''ہم نے صدر مرسی سے رابطہ کر کے معاملات طے کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن انھوں نے ہماری بات ماننے سے انکار کر دیا۔ پھر ہم نے 'مصری دوستوں' کے ساتھ مل کر ان کا تختہ اُلٹ دیا''۔

صدر محمد مرسی نے اپنے ایک سالہ دورِ اقتدار ہی میں ملک کو وہ دستور دیا، جس کی تیاری میں بلامبالغہ ملک کے تمام نمایندوں کو شریک کیا گیا۔ ۱۰۰ رکنی دستوری کونسل نے ایک ایک شق پر باقاعدہ ووٹنگ کرواتے ہوئے ۲۳۶ شقوں پر مشتمل دستوری مسودہ تیار کیا۔ اصل مقتدر قوتوں کی سرپرستی میں اس کے خلاف بھی طوفان کھڑا کر دیا گیا۔ سپریم دستوری عدالت نے نومنتخب قومی اسمبلی صدارتی انتخاب سے چند گھنٹے قبل تحلیل کر دی۔ اب سازش یہ تھی کہ نہ صرف نومنتخب سینیٹ بھی توڑ دی جائے، بلکہ صدر کا انتخاب بھی چیلنج کرتے ہوئے ملک و قوم کی سب قربانیاں خاک میں ملا دی جائیں۔ اس موقعے پر مجبور ہو کر صدر نے ایک چار نکاتی آرڈی ننس جاری کیا، جس کے اہم ترین نکات دو تھے۔ عوامی ریفرنڈم کے ذریعے دستور کی منظوری تک سینیٹ کو نہیں توڑا جا سکتا اور دستور منظور ہونے تک صدر کے کسی فیصلے کو عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ بس اسی

آرڈی ننس کو آج تک بعض لوگ صدر مرسی اور اخوان کی فرعونیت کا الزام لگاتے ہوئے جھوٹے پروپیگنڈے کا پرچار کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ صدر نے دستوری کونسل کو یہ اختیار دیا تھا کہ وہ ان کی عدم موجودگی میں اس آرڈی ننس کا جائزہ لے کر جو بھی فیصلہ کرے گی، انھیں منظور ہوگا۔ کونسل نے آرڈی ننس منسوخ کرنے کی سفارش کی تو صدر نے آرڈی ننس منسوخ کر دیا تھا۔

شہید صدر کی اہلیہ نے درست کہا کہ بظاہر صدر محمد مرسی کو چھے سال قید تنہائی اور مظالم کا نشانہ بنایا گیا ہے، لیکن عملاً انھوں نے سات سال یہ ظلم وستم برداشت کیا۔ صدارت کا ایک سال بھی درحقیقت قید ہی کا ایک سال تھا۔ المیہ یہ ہے کہ مصر کو خاک وخون میں نہلا دینے اور ناکامی و نامرادی کی بدترین مثال بنا دینے والے حکمران اس موقعے پر بھی شہید صدر پر اعتراضات کا وہی راگ الاپ رہے ہیں۔ میرے سامنے اس وقت مصری وزیر اوقاف کی طرف سے مساجد کے تمام ائمہ و خطبا کے نام جاری حکم نامے کی کاپی پڑی ہے۔ حکم یہ جاری کیا گیا ہے کہ: ''خطبۂ جمعہ میں سابق صدر محمد مرسی کے جرائم پر تفصیل سے بات کی جائے، اور بلند آواز میں ان کے لیے بددُعائیں کی جائیں، تاکہ اس پر اللہ کا عذاب نازل ہو''۔ تمام عمر قرآن کے زیر سایہ گزارنے والا صدر محمد مرسی تو اب ان ظالموں کے ہر ستم سے آزاد و بالاتر ہو گیا لیکن یہ حکم نامہ خود ان ظالم حکمرانوں اور ان کے بدقسمت دلالوں کا قبیح چہرہ بے نقاب کر رہا ہے۔

مصری عوام کو صدر محمد مرسی کی نماز جنازہ کی اجازت نہیں دی گئی، لیکن وہ شاید تاریخ حاضر کی اکلوتی شخصیت ہیں کہ دنیا بھر میں لاکھوں نہیں کروڑوں اہل ایمان نے جن کی غائبانہ نمازِ جنازہ سب سے زیادہ مرتبہ ادا کی۔ بددُعاؤں کا سرکلر جاری کرنے والے وزیر اور اس کے روسیاہ آقا جنرل سیسی کو شاید یاد نہیں رہا کہ دُعا اور بددُعا کا تعلق سرکلر سے نہیں، دلوں سے ہوتا ہے اور آج اللہ نے دنیا بھر میں اپنے شہید بندے کے لیے محبت واحترام کی ہوائیں چلا دی ہیں۔ یہی اس کا وعدہ بھی ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَھُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (مریم ۱۹:۹۶) ''یقیناً جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور عمل صالح کر رہے ہیں عنقریب رحمان ان کے لیے دلوں میں محبت پیدا کر دے گا''۔

ایک اہم اور تلخ ترین حقیقت یہ بھی ہے کہ مظلوم صدر محمد مرسی تو اپنی نیکیوں اور خطاؤں سمیت اللہ کے حضور پہنچ گئے۔ اب وہ ہر طرح کے ظلم وستم سے بھی نجات پا گئے، لیکن اس لمحے بھی مصر کی جیلوں میں ۶۰ ہزار سے زائد بے گناہ قدسی نفوس گذشتہ چھے سال سے بدترین مظالم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ ان میں ہزاروں کی تعداد میں عالمی جامعات سے فارغ التحصیل اعلیٰ تعلیم یافتہ اور حفاظ کرام بھی شامل ہیں۔ ان میں بوڑھے بھی ہیں اور خواتین بھی۔ اب تک ان میں سے ۹۰۰ کے قریب قیدی تشدد اور مظالم کی وجہ سے شہید ہو چکے ہیں۔ یہ ۶۰ ہزار فرشتہ سیرت انسان عالمی ضمیر کے منہ پر مصری آمر کی جانب سے ایک طمانچہ ہیں۔ کیا حقوق انسانی، توہین رسالت تک کی اجازت چاہنے کے لیے آزادیِ رائے کی دہائیاں دینے والے عالمی ادارے، اس پر بھی زبان کھولیں گے؟

☆☆☆

❑ عالم اسلام

شاہ عبداللہ اور امام مرسی
دو کردار، دو انجام

ڈاکٹر محی الدین غازی

دیکھنے والوں کے لئے تاریخ میں عبرت کے بہت سے مقامات ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ حکمرانوں کی تاریخ عام انسانوں کی تاریخ سے زیادہ عبرت ناک اور سبق آموز ہوتی ہے۔

سترہ جون سنہ 2012 کا دن مصر کی تاریخ کا بہت اہم دن تھا، اس دن مصر کی تاریخ میں پہلی بار صاف وشفاف انتخابات کے نتائج سامنے آئے، اور امام محمد مرسی مصر کے پہلے منتخب صدر قرار دئے گئے۔ امام مرسی نے منتخب ہونے کے بعد سب سے پہلے جولائی کے دوسرے ہفتے میں ہی سرزمین حرم کا رخ کیا۔ اس سفر میں انہوں نے سعودی عرب کے شاہ عبداللہ سے ملاقات بھی کی۔ اس وقت مصر کے مالی حالات بہت خراب تھے، لیکن اس ملاقات میں انہوں نے مالی مدد کی بھیک کے لئے دامن نہیں پھیلایا، بلکہ مل جل کر ایک طاقت ور اسلامی بلاک قائم کرنے کی بات کی۔ امام مرسی اس کے بعد اگست کے اواخر میں ایران گئے، اور طہران میں منعقد ناوابستہ ممالک کی چوٹی کانفرس میں خلفاء راشدین کا ذکر خیر کیا، اور شامی حکومت کے ظلم پر سخت تنقید کی، جس پر شام کے وفد نے کانفرس سے واک آؤٹ کر دیا۔ ایران کے ایک ٹی وی چینل نے خلفاء راشدین کے ذکر کو حذف کر دیا اور شام کی جگہ بحرین کر دیا، جس پر دنیا بھر میں ایران پر سخت تنقید ہوئی۔

امام مرسی سعودی عرب کے ساتھ مل کر امت کے عروج کی راہیں ہموار کرنا چاہتے تھے، لیکن شاہ عبداللہ نے تو ایک خطرناک شیطانی کھیل کھیلنے کی ٹھانی ہوئی تھی، ان کے اوپر یہ خبط سوار تھا کہ عالم عرب میں آئی ہوئی بہار کو ہر قیمت پر خزاں میں بدل دیا جائے۔ چنانچہ ایک بہت بڑی سازش رچی گئی، اور شاہ عبداللہ، محمد بن زاید، مصری فوج کے جرنیل، اور اسرائیل کی خفیہ ایجنسی (موساد) اور ان کے بہت سے مذہبی اور لبرل ایجنٹ عناصر نے مل کر ایک سال کے اختتام پر امام مرسی کی حکومت کے خلاف بغاوت کرادی، اور خیر وبھلائی کے اس پھول کو کھلنے سے پہلے ہی مسل ڈالا۔

اس بغاوت کے خلاف ہزاروں جیالے رابعہ کے میدان میں پرامن احتجاج کرنے بیٹھ گئے، وہ چالیس دن تک پرامن احتجاج کی عظیم ترین مثال پیش کرتے رہے، اور خود کو مہذب سمجھنے والی دنیا کے اجتماعی ضمیر پر کچوکے لگاتے رہے، مگر دنیا کا ضمیر سوتا بنا رہا۔ آخر کار باغی حکومت کے حوصلے بڑھے، اور چودہ اگست سنہ 2013 کا وہ سیاہ دن بھی دنیا نے دیکھا جب ان نہتے مسلمانوں کے خلاف اس دور کی بدترین فوجی کارروائی کی گئی، اس کارروائی میں ہزاروں مسلمان شہید ہوئے، سینکڑوں نہتے مردوں اور عورتوں کو نذر آتش کر دیا گیا، اور اس کے ساتھ ہی اسلام کے ہزاروں متوالوں کو جیلوں میں بھر دیا گیا۔ امام مرسی کے ساتھ ملک کے بڑے بڑے سینکڑوں علماء

کرام اور ہزاروں دین پسند نوجوان مرد اور عورتیں جھوٹے مقدمات، فرضی عدالتی کارروائیوں اور سخت ترین تعذیب کا نشانہ بنائے گئے، اوراس طرح چھ سال گزر گئے۔

اللہ کی مشیت دیکھیں، کہ میدان رابعہ کے قتل عام کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا اور تیئیس جنوری سنہ 2015 کو شاہ عبداللہ کی موت کی خبر کا اعلان ہوگیا۔ جس طرح کبھی ظالم حجاج کے مرنے پر امت کے صالحین نے (ألا لعنة الله على الظالمين (سنو اللہ کی لعنت ظالموں پر ہے) پڑھا تھا، شاہ عبداللہ کے مرنے پر بھی دنیا بھر میں اہل اسلام نے یہ جملہ دوہرایا۔

ظالموں پر اللہ کی لعنت تو یقینی حقیقت ہے۔ اوراس کا کبھی کبھی دنیا میں اظہار بھی ہوتا رہتا ہے۔ شاہ عبداللہ کے بیٹے اپنے باپ کے ساتھ جس طرح کار حکمرانی میں شریک تھے، اسی طرح ظلم وخوں ریزی کے منصوبوں میں بھی ان کے ساتھ شریک تھے، خاص طور سے ان کا بیٹا متعب بن عبداللہ جو اس وقت سعودی عرب کی قومی افواج کا سربراہ تھا سب سے پیش پیش تھا، وہ اس وقت کا محمد بن سلمان تھا۔ پھر جب زمین پر اللہ کی عدالت کا ظہور ہوا، تو دنیا نے دم بخود ہوکر دیکھا کہ سنہ 2017 میں متعب سمیت چار بھائیوں کو ان کے چچازاد بھائی محمد بن سلمان نے ایک ہوٹل میں مالی بدعنوانی کا الزام لگا کر نظر بند کردیا، اور ہفتوں بند رکھا۔ یہاں تک کہ انہیں دس بلین ڈالر کے اثاثوں کے عوض وہاں سے رہائی ملی۔ متعب اور اس کے بھائیوں نے مل کر اتنی خطیر رقم کے اثاثے بن سلمان کے حوالے کردئے۔ شاہ عبداللہ کے ایک بیٹے عبدالعزیز نے جو باپ کے زمانے میں نائب وزیر خارجہ تھا علاج کے بہانے ملک سے فرار ہوکر فرانس میں سیاسی پناہ لی۔ متعب اور اس کے سب بھائیوں کو تمام عہدوں سے معزول کردیا گیا، اور ان کی نقل وحرکت پر پابندیاں عائد کردی گئیں۔

غرض یہ کہ 2013 میں شاہ عبداللہ اور اس کے بیٹے مل کر عالم اسلام میں تباہی کا سامان کررہے تھے، مگر 2017 تک محض چار سال کے اندر ان شہزادوں کی یہ حالت ہوگئی کہ سارا غرور خاک میں مل گیا، اور اپنے ہی ملک میں جہاں عوام وخواص دن رات ان کی بڑائی کے گن گاتے تھے، ذلیل قیدی بن کر رہ گئے، ملک کے میڈیا میں ان کا ذکر مالی بدعنوانیوں کے حوالے سے کیا جانے لگا۔ ان شہزادوں کی حالت زار اب یہ ہے کہ سعودی عرب میں کسی کی ہمت نہیں ہوتی ہے کہ ان کی ہم دردی میں دولفظ بول دے۔ سعودی عرب کے درباری علماء نے بھی اپنی عادت کے مطابق شاہ عبداللہ اور اس کے بیٹوں کو چھوڑ کر شاہ سلمان اور محمد بن سلمان کی پرستش شروع کردی، کیوں کہ وہ ہمیشہ زندوں کی پوجا کرتے ہیں، مردوں سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہوتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت شاہ عبداللہ کی ساری اولاد پر جتنا برا وقت آیا ہے، سعودی شاہوں میں سے کسی کی اولاد پر ایسا برا وقت نہیں آیا۔ یہ واضح طور پر اللہ کی عدالت کا ظہور ہے، میدان رابعہ کے قتل عام پر صرف چار سال گزرے اور دنیا نے اس کے کچھ ذمہ داروں کا عبرت ناک انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ شاہ عبداللہ نے دنیا بھر کے ڈکٹیٹروں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے امت کو ڈکٹیٹرشپ کی طرف ڈھکیلا، اور آج ان کے بیٹے ڈکٹیٹرشپ کا سب سے زیادہ شکار ہیں، اور دنیا کا کوئی ڈکٹیٹر ان کے حق میں دولفظ بولنے کا روادار نہیں ہے۔

عبرت کے لئے یہ اشارہ کافی ہے کہ ذرائع کے مطابق شاہ عبداللہ اور ان کے بیٹوں نے مصری افواج کو دس بلین ڈالر دے کر مصر کی آزادی کا سودا کرایا تھا اور وہاں اسلام پسندوں کا بے دردی سے قتل عام کرایا تھا، اور پھر شاہ عبداللہ کے بیٹوں کو اپنی جاں بخشی کے لئے بھی دس بلین ڈالر دینے پڑے، جس کے بعد جاں بخشی تو ہوگئی مگر غلامی اور رسوائی ان پر بری

طرح مسلط ہوگئی۔

عبرت کی بات یہ بھی ہے کہ شاہ عبداللہ کی اولاد کو نمونہ عبرت بنانے کے لئے مشیت ایزدی نے محمد بن سلمان کو استعمال کیا۔ لیکن محمد بن سلمان کو خود اس بات کا احساس نہیں ہورہا ہے، اور وہ بھی صہیونی طاقتوں کی طرف سے بخشے گئے اقتدار کے نشے میں بدمست ہوکر اسی انجام کی طرف کشاں کشاں بڑھا جارہا ہے۔

دوسری طرف امام مرسی پر اللہ کی رحمتوں کا مشاہدہ کریں، اللہ نے امام مرسی کو اپنی راہ میں قید وبند کے سخت امتحان سے گزرنے کا حوصلہ دیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ چھ سال جیل کے عقوبت خانوں میں صبر وشکر کے ساتھ دن دن بھر اور رات رات بھر اللہ کے ذکر، اس کی کتاب کی تلاوت اور اس کی عبادت میں مصروف رہے، اور اس طرح قرب الٰہی کے درجات طے کرتے رہے۔ پھر ان کی وفات اس شان کے ساتھ ہوئی کہ پوری امت نے انہیں شہید کہہ کر پکارا، صالحین نے ان کی صالحیت کے گن گائے، اور ان کی عظمت پر تمام امت نے اتفاق کا اظہار کیا۔ انہیں بدنام کرنے کے لئے جھوٹ کے جتنے جالے بنے گئے تھے وہ سب یکا یک غائب ہوگئے۔

سب سے خاص بات یہ ہے کہ ان کی غائبانہ نماز جنازہ پوری دنیا میں بار بار نہیں ہزاروں بار پڑھی گئی۔ امام احمد بن حنبل کہتے تھے کہ ہمارے اور ظالموں کے درمیان جنازے کے دن فیصلہ ہوگا۔ بلاشبہ امام مرسی کا جنازہ اسلامی تاریخ میں سب سے چھوٹے جنازوں میں شمار کیا جائے گا، کیوں کہ ظالموں نے مسلمانوں کو ان کی نماز جنازہ پڑھنے نہیں دی۔ لیکن اسلامی تاریخ میں سب سے بڑے پیمانے پر غائبانہ نماز جنازہ پڑھے جانے کا اعزاز اللہ تعالی نے امام مرسی کے نصیب میں رکھا۔ خاص بات یہ ہے کہ حنفی اور مالکی مسلکوں میں غائبانہ نماز جنازہ نہیں ہے، پھر بھی تمام مسلمانوں کے ساتھ دنیا بھر کے کروڑوں حنفیوں اور مالکیوں نے بلا تردد ان کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی، اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ سوچتا ہوں امام ابوحنیفہ اور امام مالک کی روحیں مسرور ومطمئن ہوں گی کہ امام مرسی کی عظمت کو خراج تحسین پیش کرنے کی راہ میں ان کا مسلک رکاوٹ نہیں بنا۔

امام مرسی کے اوپر ہونے والے ظلم وجبر پر پوری امت نے بے پناہ غم وغصے کا اظہار کیا۔ ہر ملک اور ہر مسلک کے لوگوں نے یک زبان ہوکر ظلم کی مذمت کی۔ سوشل میڈیا کی ساری دیواریں امام مرسی کی نورانی تصویروں اور انہیں خراج تحسین پیش کرنے والی تحریروں سے رنگین ہوگئیں۔ اس دور میں پوری امت کی ایسی بے پناہ محبت شاید ہی کسی کے حصے میں آئی ہو۔

امام مرسی کی وفات پر ساری امت سوگوار ہے، لیکن سب سے زیادہ حسرت وغم کی کیفیت حرمین کی دیواروں پر چھائی ہے۔ حرمین کی حرمت کو پامال کرتے ہوئے وہاں دور حاضر کے نہ جانے کتنے ظالم طاغوتوں کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی گئی ہے۔ راقم خود ایسی کئی نمازوں میں بادل ناخواستہ شریک ہوا، اور ظالموں کے لئے نصرت کی دعا کرکے دل کو تسلی دی۔ جب کہ امام مرسی کی سب سے پہلی غائبانہ نماز جنازہ اسرائیل کے زیر تسلط مسجد اقصی میں ادا کی گئی، لیکن حرمین کو اس شرف سے یکسر محروم رکھا گیا۔ اس پر کسی نے بجا طور پر تبصرہ کیا کہ امت اسی سے اندازہ کرلے کہ صہیونیت کا تسلط حقیقت میں سب سے زیادہ کہاں ہے۔ خیر ظالموں کی رسوائی کے لئے یہ خبر کافی ہے کہ حرمین میں بھی لاتعداد اہل اسلام نے انفرادی طور پر امام مرسی کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی۔ یہ تو دنیا میں عدالت الٰہی کی کچھ جھلکیاں ہیں، ابھی آخرت کی عدالت کے روبرو ہونا باقی ہے۔ اس دنیا میں ہونے والا ظلم کا ہر واقعہ آخرت کی عدالت کے یقینی ہونے کی گواہی دیتا ہے۔

☆☆☆

❑ عالم اسلام

حافظ ڈاکٹر محمد مرسی شہید
جس نے خلافتِ راشدہ کی یاد تازہ کردی

مولانا سید احمد ومیض ندوی
استاذ حدیث دارالعلوم، حیدرآباد
Email: awameez@gmail.com

گذشتہ دنوں مصر کے سابق اولین منتخب جمہوری صدر ڈاکٹر محمد مرسی کی شہادت کا جو سانحہ پیش آیا اس نے امتِ مسلمہ کی چولیں ہلا دیں، دنیا بھر میں غلبۂ اسلام اور سربلندی دین متین کی دیرینہ آرزو رکھنے والے فرزندان توحید پر سکتہ طاری ہوگیا، ایک طرف اگر امریکہ اور مغرب کے پٹھو عرب حکمراں حلقوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تو دوسری جانب پوری دنیا میں بسنے والی امتِ مسلمہ کے اربوں افراد پر غم واندوہ کے بادل چھا گئے، امتِ مسلمہ کا ہر طبقہ سوگوار ہوگیا، ہر طرف سے یہی کہا جارہا ہے کہ مرسی کو طبعی موت نہیں آئی بلکہ انہیں شہید کردیا گیا۔

اخوان المسلمین کے قائد مرد مجاہد شہید مرسی کا سانحہ عام سانحوں سے بالکل مختلف ہے، اس کا سرا صہیونی وصلیبی سازشوں سے جاملتا ہے، اسلام دشمن مغرب کسی قیمت پر نہیں چاہتا کہ عالم اسلام میں ایک کامیاب انقلاب آفریں اور مؤثر قیادت پھلے پھولے، ایسی قیادت جو مسلم ممالک کو خوشحالی کی جانب گامزن کرنے کی آرزو رکھتی ہو، جو اقامت دین اور غلبۂ اسلام کے دیرینہ خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنا چاہتی ہو، جو متحدہ اسلامی بلاک تشکیل کرکے خلافتِ اسلامیہ کی نشأۃ ثانیہ کی خواہش مند ہو، ماضی قریب کی تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی عالم اسلام میں ایسے کسی باکمال مرد مجاہد کے ابھرنے کے آثار پیدا ہوئے مغرب فوراً حرکت میں آگیا اور صلیب و صہیون کے فرزندوں نے سازشوں کے ایسے جال بنے کہ ایسا قائد مطلوبہ کردار ادا کرنے سے پہلے ہی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ شاہ فیصل اور جنرل ضیاء الحق کے سانحوں کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے۔ ان دونوں عظیم شخصیات کی شہادت کے پس پردہ مغربی سازشوں کا کلیدی کردار رہا ہے، ملتِ اسلامیہ کو صحیح اور مؤثر قیادت سے محروم رکھنا مغرب کا بہت بڑا ایجنڈا ہے، اخوان المسلمین اور مرسی کی قیادت روز اول سے مغرب کی نگاہوں میں کھٹک رہی تھی، مصری عوام ایک طویل عرصہ تک آمریت کی چکی میں پسی جارہی تھی، جمال عبدالناصر اور انور

سادات سے لے کر حسنی مبارک تک آمر حکمرانوں کے ظلم وجور سے تنگ مصری مسلمانوں نے ایک ایسی قیادت کو چنا تھا جو نہ صرف مصر کے لیے بلکہ پورے عالم اسلام کے لیے فال نیک تھی، ۱۷ر جون ۲۰۱۲ء کا دن اہل مصر اور پوری ملت اسلامیہ کے لیے ایک یادگار تاریخی دن تھا، جب مصر کی پوری تاریخ میں پہلی مرتبہ صاف وشفاف انتخابات کے بعد محمد مرسی کا ملک کے پہلے منتخب صدر کے طور پر انتخاب عمل میں آیا، مرسی نے صدارت کا حلف اٹھانے سے قبل لاکھوں لوگوں کے سامنے اعلان کیا کہ وہ مصری عوام کی خوشحالی شریعت کے نفاذ اور قضیہ فلسطین سمیت تمام اسلامی ایشوز پر کمپرمائز نہیں کریں گے، اس مرد مجاہد نے کہا کہ شریعت کے نفاذ کے لیے ان کی جان بھی جاتی ہے تو وہ اس کے لیے تیار ہیں، اقتدار سنبھالنے کے بعد انہوں نے سب سے پہلا دورہ سرزمین حجاز کا کیا، جہاں انہوں نے اس وقت کے سعودی سربراہ شاہ عبداللہ سے ملاقات کی، اور ان سے ایک طاقتور اسلامی بلاک قائم کرنے کے عزائم کا اظہار کیا، پھر اگست میں ایران کا دورہ کیا، اور تہران میں منعقدہ ناوابستہ ممالک کی چوٹی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے خلفائے راشدین کا ذکر کیا، ایران کی سرزمین اور حکومتی اسٹیج پر خلفائے راشدین کا ذکر کوئی معمولی بات نہ تھی، اتنا ہی نہیں انہوں نے ببانگ دہل شامی حکومت کی بربریت کی پرزور الفاظ میں مذمت کی، جس پر شام کے وفد نے کانفرنس سے واک آؤٹ کیا۔

محمد مرسی کا انتخاب دراصل پوری دنیا کے اسلام پسندوں کے لیے نوید مسرت تھی، مرسی کا اقتدار عالم اسلام کے لیے مژدۂ رحمت تھا، چنانچہ مرسی نے بلا کسی تاخیر ایسے اقدامات کا آغاز کر دیا جس سے عالم اسلام کے مغرب نواز حکمراں تلملا اٹھے، اقتدار سنبھالتے ہی مرسی نے اسرائیل کے ساتھ کئے گئے تمام معاہدات منسوخ کر دئے، صحرائے سینا میں تیل کے کنویں موجود تھے جن کی ساری آمدنی اسرائیل کو جاتی تھی، مرسی نے اس شرمناک معاہدے کو منسوخ کر دیا، اسی طرح صحرائے سینا کی جو سرحد غزہ پٹی سے ملتی تھی وہ برسوں سے بند تھی جس سے غزہ کے مکینوں کو بڑی مشکلات کا سامنا تھا، مصری فوج کے مورچوں کا رخ مصر کی طرف ہوتا تھا تاکہ کوئی غزہ میں داخل نہ ہو سکے، مرسی کے اقتدار کے بعد نہ صرف اس راہ داری کو کھول دیا گیا بلکہ غزہ میں ایک بڑے جشن کا اہتمام کیا گیا، حماس کے جلاوطن رہنما خالد مشعل نے ۳۵ سال بعد وطن لوٹ کر جشن کی قیادت کی تھی جس سے فلسطینیوں کے حوصلے بلند ہوئے، مرسی شہید غیرتِ ایمانی، حمیتِ دینی اور جرأت اسلامی کے عظیم پیکر تھے، مرسی کو صرف اہل مصر کا صدر کہنا ان کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوگی، وہ صرف مصریوں کے صدر نہیں تھے بلکہ وہ پوری مسلم امہ کے لیڈر تھے، انہیں روز اول سے فلسطینی مسلمانوں کی مشکلات کا اندازہ تھا، محمد مرسی کی ۲۰۱۲ء کی ایک تقریر نے صہیونیوں میں نفرت کی آگ بھڑکا دی، لیکن دوسری طرف اس تقریر نے فلسطینیوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے والوں کو ایسا حوصلہ بخشا کہ رہتی دنیا تک فلسطینی مسلمان ان کی جرأت کو خراج عقیدت پیش کرتے رہیں گے، مرسی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ۲۰۱۲ء میں غزہ پر مسلط کی گئی اسرائیل کی

جنگ کے دوران جرأت کے ساتھ غاصب صہیونیوں کو للکارا، جس کی مصر کی تاریخ میں نظیر ملنی مشکل ہے، قابض صہیونی فوج نے ۱۴/ نومبر ۲۰۱۲ء کو القسام کمانڈر احمد الجعبری کو ایک فضائی حملہ میں شہید کیا، اسرائیل کی اس مجرمانہ واردات پر مرسی پہلے مصری صدر تھے، جنہوں نے صہیونی ریاست سے اپنا سفیر واپس بلالیا اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ عرب وزراء خارجہ کا اجلاس طلب کیا اور سلامتی کونسل کا ہنگامی اجلاس بلانے کا مطالبہ کیا، ایسی مشکل گھڑی میں مرسی نے غزہ کے مسلمانوں کے ساتھ یکجہتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ مصری قوم حکومت اور قیادت غزہ کے عوام کو تنہا نہیں چھوڑیں گے، مرسی نے غزہ پر اسرائیلی جارحیت کے دوران اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ غزہ پر جارحیت قاہرہ پر جارحیت کے مترادف ہے، مرسی نے اہل غزہ کے لیے بہت کچھ عملی اقدامات کئے، غزہ کی واحد بین الاقوامی گزرگاہ رفح کو غیر مشروط طور پر دوطرفہ آمدورفت کے لیے کھول دیا، اور محصورین غزہ کو غذائی وطبی سامان سپلائی کرنے والے قافلوں کو مکمل اجازت دی، نیز غزہ کے زخمیوں اور بیماروں کو مصری اسپتالوں میں علاج کے لیے لے جایا گیا۔ ۲۰۱۲ء میں غزہ پر اسرائیلی جارحیت کو روکنے کے لیے مرسی نے سفارتی سطح پر بھی بہت کچھ اقدامات کئے۔

مرسی کا منصوبہ تھا کہ سعودی عرب اور ترکی کے اشتراک سے ایک ایسی قوت تشکیل دی جائے جو مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو پھر سے بحال کرے، بالخصوص بہار عرب کے نتیجہ میں پیدا صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عالم اسلام کو مغرب کے آہنی شکنجے سے آزاد کرایا جائے، مرسی امتِ مسلمہ کی نشأۃ ثانیہ کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتے تھے؛ لیکن ان کے اقتدار کو ابھی ایک سال بھی مکمل نہ ہو پایا تھا کہ خلیجی ملکوں کے مغرب نواز حکمرانوں نے ان کے خلاف ایک بہت بڑی سازش رچ کر مصری فوج کو بغاوت پر آمادہ کیا، مصری فوج کے یہودنژاد جرنیل سیسی نے- جسے خود مرسی نے فوج کی سربراہی سونپی تھی- مرسی اقتدار کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، اس بغاوت کے خلاف ہزاروں مصری باشندے رابعہ میدان میں چالیس دن تک پرامن احتجاج کرتے رہے؛ لیکن عالمی ضمیر کو ذرہ برابر جنبش نہ ہوئی، آخر ظالم سیسی نے ۱۴/ اگست ۲۰۱۳ء میں نہتے پرامن احتجاجیوں کے خلاف فوجی کاروائی کردی، جس میں ہزاروں بے قصور مسلمان شہید ہوئے اور ہزاروں کو پس دیوار زنداں کردیا گیا، مرسی کے ساتھ سیکڑوں علماء اور اخوانی قائدین کو جیلوں میں ٹھونس دیا گیا، اور اذیت ناک سزائیں دی گئیں، مرسی طبعی موت نہیں مرے، انہیں مسلسل طبی سہولیات سے محروم رکھا گیا، اور دردناک اذیتیں دی جاتی رہیں، بالآخر وہ مرد مجاہد کمرۂ عدالت میں جج کے روبرو بیان دیتے ہوئے گر پڑا اور اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کردی، مرسی کو قسط وار موت کے گھاٹ اتارا گیا، یہی وجہ ہے کہ آج پوری دنیا ان کی موت کو شہادت قرار دے رہی ہے، بلا شبہ مرسی اب ہمارے درمیان نہیں رہے، لیکن ان کا خون رائیگاں نہیں جائے گا، وہ جام شہادت نوش کرکے زندۂ جاوید ہوگئے، ان کے مفاد پرست اور مغرب نواز مخالفین تاریخ کے کوڑے دان کا حصہ بن گئے، وہ ہمیشہ غدار اور منافق کے طور پر جانے

جائیں گے، مرسی عدل کے خوگر اور انصاف کے علمبردار تھے، وہ حسن البنا شہید کے سچے وارث تھے، مرسی کا قصور بس یہ تھا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی چاہتے تھے اور عالم اسلام کو مغرب کی کاسہ لیسی سے نکال کر طاقت وعظمت کی بلند چوٹیوں پر پہونچانا چاہتے تھے، وہ اہل مصر کو موجودہ دور کے فراعنہ کے مظالم سے نجات دلانے کے متمنی تھے، وہ سرزمین مصر پر خدا کی شریعت کا نفاذ چاہتے تھے، وہ مصر اور عالم اسلام سے یہود ونصاریٰ کی بالا دستی ختم کرنا چاہتے تھے۔

مرسی عالم اسلام میں کس قدر مقبول تھے اور لوگوں کے دلوں میں ان کے لیے کس قدر احترام تھا اسے جاننے کے لیے اتنی سی بات کافی ہے کہ ان کی شہادت پر ترکی سے لے کر قطر تک اور ہندوستان سے لے کر مراکش تک پوری دنیا میں ان کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی گئی، مرسی کا دورِ اقتدار اگرچہ مختصر تھا لیکن انہوں نے اس مختصر سے عرصہ میں خلافت راشدہ کی یاد تازہ کردی، چنانچہ ان کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ صدر بننے کے بعد انہوں نے قصر صدارت میں قیام کو ناپسند کیا، جب کہ قاہرہ میں مصری صدر کے لیے کئی ایکڑوں پر محیط آسائش زندگی سے بھرپور ایک سے زائد محل ہیں، ان میں قیام کرکے داد عیش دینے کے بجائے قاہرہ میں ایک معمولی فلیٹ کرایہ پر لیا اور اہل خانہ سمیت وہاں رہائش پذیر ہوئے۔ اسی طرح جس وقت مرسی صدر تھے ان کی بہن شدید بیمار ہوئیں جب وہ عیادت کے لیے اسپتال پہونچے تو ڈاکٹروں نے بتایا کہ اگر آپ چاہیں تو بہن کا علاج امریکی یا یورپی اسپتال میں ہوسکتا ہے، بس آپ کے حکم کی دیر ہے، ہیلی کاپٹر انہیں لیکر روانہ ہوجائے گا، مرسی نے کہا میرے خاندان والے کبھی نہیں چاہیں گے کہ میری بلند مرتبہ حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھایا جائے، آخران کی بہن عام مصری اسپتال میں انتقال کرگئیں، مگر مرسی نے بہن کی خاطر اپنے اصولوں کو توڑنا گوارا نہیں کیا، صدر مرسی کو اپنی عوام کی فکر اسی طرح دامن گیر رہتی تھی جس طرح خلفائے راشدین اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کو اپنی رعایا کا غم ستایا کرتا تھا، ایک مرتبہ صدر مرسی صبح سویرے سرکاری گاڑی میں قصر صدارت جارہے تھے، انہیں راستے میں فٹ پاتھ پر ایک عورت بیٹھی نظر آئی، انہوں نے اس کے سامنے گاڑی رکوادی اور گاڑی سے اترے اور عورت سے پوچھا: تم فٹ پاتھ پر کیوں رہتی ہو؟ عورت بولی میرا خاوند فوت ہوگیا، میں تنہا فلیٹ کا کرایہ ادا نہیں کرسکتی تھی؛ اس لیے فٹ پاتھ پر آپڑی ہوں، صدر مرسی نے اس خاتون سے کہا جب تک میں مصر کا حاکم ہوں کسی خاتون کو ایسی تکالیف برداشت نہیں کرنا پڑے گی، پھر انہوں نے اپنے اسٹاف کو حکم دیا کہ وہ اس عورت کے لیے فلیٹ کا بندوبست کریں اور اتنی رقم دیں کہ وہ باعزت زندگی بسر کرسکے۔

۲۰۰۴ء میں جب انڈونیشی علاقہ بندہ آچے سنامی سے تباہ ہوا تو محمد مرسی مصری وفد کے ساتھ وہاں پہونچے اور سیکڑوں بے گھر افراد کو مالی امداد دی، مرسی کا ایک تاریخی اقدام جو سنہرے حروف سے لکھا جائے گا یہ تھا کہ جب وہ صدر منتخب ہوئے تو شام کے سفاک بشارالاسد نے انہیں مبارکباد کا پیغام بھیجوایا، صدر مرسی نے یوں

جواب دیا: میں آپ کو شامی عوام کا جائز نمائندہ نہیں سمجھتا، صدر مرسی کے تعلق سے یہ انکشاف بھی چونکا دینے والا ہے کہ وہ دنیا میں سب سے کم تنخواہ لینے والے صدر تھے، ان کی سالانہ تنخواہ صرف ۱۰ ہزار ڈالر تھی، حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جب فوجیوں نے انہیں گرفتار کیا تو یہ راز بھی کھلا کہ انہوں نے اب تک کوئی تنخواہ نہیں لی تھی، دیگر ممالک کی طرح مصر میں بھی سرکاری عمارتوں میں صدر کی تصاویر آویزاں کی جاتی ہیں، جب مرسی صدر بنے تو انہوں نے حکم دیا تھا کہ سرکاری عمارتوں میں ان کی تصویر نہ لگائی جائے، جب کہ اس کے لیے ۵۰۰ ملین کا بجٹ روایتی طور پر موجود تھا، اسی طرح مرسی کے حکم پر پچھلے تمام حکمرانوں کی تصاویر ہٹا کر اللہ کے نام کی تختیاں لگادی گئیں، پھر جوں ہی مرسی کو بے دخل کیا گیا فوجی جرنیلوں کی تصویریں پھر سے آویزاں کردی گئیں، صدر مرسی کی طرح ان کی اہلیہ بھی نہایت سادگی پسند خاتون ہیں، شوہر کے صدر منتخب ہونے پر جب لوگ انہیں مصر کی خاتون اول کہنے لگے تو انہوں نے صاف کہا میں خاتون اول نہیں ہوں بلکہ مجھے ملازم اول سمجھیں۔

سوانحی خاکہ:

محمد مرسی ۸/ اگست ۱۹۵۱ء کو شمالی مصر کے العدوہ گاؤں میں پیدا ہوئے، والد کاشت کار تھے اور والدہ ماجدہ معمولی پڑھی لکھی گھریلو خاتون تھیں، مرسی پانچ بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے، ۱۹۷۵ء سے ۱۹۷۶ء تک مرسی نے مصری فوج کے کیمیائی ہتھیاروں والے دستے میں عسکری خدمات انجام دیں، پھر اپنے تعلیمی سلسلہ کو جاری رکھا، جامعہ قاہرہ سے انجینئرنگ میں ایم فل کی سند حاصل کرلی، حکومت مصر نے ان کی اعلیٰ تعلیمی کارکردگی کی وجہ سے انہیں امریکہ میں ڈاکٹریٹ کی تعلیم کے لیے منتخب کیا، چنانچہ ۱۹۸۲ء میں یونیورسٹی آف ساؤدرن کیلیفورنیا سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، پھر فراغت تعلیم کے بعد مرسی امریکہ ہی میں کیلیفورنیا اسٹیٹ یونیورسٹی میں ۱۹۸۲ء سے ۱۹۸۵ء تک تدریسی خدمات انجام دیتے رہے، اس دوران وہ اپنی اعلیٰ ترین پیشہ وارانہ خدمات کی وجہ سے عالمی شہرت یافتہ خلائی ادارے ناسا میں بھی کام کرتے رہے، تین سالہ خدمات کے بعد مرسی مصر لوٹ آئے اور جامعہ الزقازیق میں بحیثیت لکچرار خدمات انجام دینے لگے اور یہ سلسلہ ۲۰۱۰ء تک جاری رہا، مرسی کو مصری تاریخ کا یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ ۲۰۰۰ء سے ۲۰۰۵ء تک مصری پارلیمان میں آزاد منتخب رکن کی حیثیت سے شامل رہے۔

۲۰۱۲ء میں جب مصر میں صدارتی انتخابات ہوئے تو اخوان المسلمین نے محمد خیرت سعد الشاطر کو اپنا صدارتی امیدوار نامزد کیا تھا، لیکن مصر کی سپریم کونسل آف آرمڈ فورسز نے ان کو انتخاب کے لیے نااہل قرار دیا، جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ اسلامی ذہن کے رہنما تھے، اخوان المسلمین نے ایک متبادل امیدوار کی حیثیت سے محمد مرسی کا نام دیا ہوا تھا، بالآخر عوامی حمایت کے نتیجہ میں ۱۴/ جون ۲۰۱۲ء کو محمد مرسی کی صدارت کا باضابطہ اعلان کردیا گیا۔

☆☆☆

❑ نقوش و تأثرات

مولانا محمد غزالی ندویؒ
حیات وخدمات کے چند گوشے

محمد خالد ضیا صدیقی ندوی
رفیق علمی امام بخاری ریسرچ اکیڈمی، علی گڑھ

نام: دادا مرحوم نے مولانا کا نام تمیز الدین (عرف) روح اللہ رکھا تھا۔ جب کہ ان کے خال معظم جناب قاری فطین اشرف صدیقی صاحب (مقیم صلالہ، سلطنت عمان) نے ان کا تاریخی نام ''مشہود ذکا غازی'' تجویز کیا تھا، پھر بعد میں بدل کر محمد غزالی رکھ دیا، اور اسی نام سے وہ مشہور ومتعارف ہوئے۔

ولادت وسکونت: مولانا مرحوم کی پیدائش ۷/ نومبر ۱۹۸۰ء مطابق ۱/محرم ۱۴۰۱ھ کو بروز جمعہ اپنے نانیہال ''مادھوپور سلطان پور'' میں ہوئی، جو صوبۂ بہار کے ضلع سیتامڑھی کا ایک گاؤں ہے۔ ان کا وطن اصلی ''سمری'' (Simri) نامی گاؤں ہے، جو مدھوبنی) بہار (کے بسفی بلاک (Bisfi block) میں واقع ہے۔ ۱۹۹۳ء جب ان کے والد محترم بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے علی گڑھ شفٹ ہوئے، تو علی گڑھ مولانا کا وطن اقامت بن گیا۔

خاندان: مولانا مرحوم ایک معزز اور ممتاز خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے دادا مرحوم جناب مولوی حبیب الرحمٰن صاحب اپنے علاقے کے ممتاز، پڑھے لکھے، شاعر وادیب اور اردو وفارسی زبان کے ماہر لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے دیدہ اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے صحبت یافتہ تھے۔ ان کے نانا مرحوم جناب حاجی محمد ابراہیم صاحب نقشبندی علاقے کے صاحب نسبت بزرگ تھے۔ بزرگوں کی ان پر نگاہ کرم تھی۔ ان کے والد محترم جناب محمد محمود صاحب اعلی عصری تعلیم یافتہ؛ مگر دینی مزاج کے حامل شخص ہیں۔ والدہ ماجدہ بھی نیک مزاج، صوم وصلاۃ کی پابند، خوش اخلاق وملنسار اور خاندان اور محلے والوں کی نگاہ میں بڑی عزت سے دیکھی جاتی ہیں۔ اللہ ان دونوں حضرات کا سایہ تادیر باقی رکھے۔ اور انھیں صحت وعافیت کے ساتھ عمر دراز عطا فرمائے۔ (آمین)

ابتدائی تعلیم: بسم اللہ کی متبرک رسم بہار کی مشہور علمی وربانی شخصیت حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ (کنہواں) نے کرائی، پھر خانگی تعلیم وتربیت کے بعد مولانا نے ابتدائی تعلیم میڈک، حیدرآباد میں پائی، جہاں ان کے والد محترم سرکاری ملازم تھے۔ بچپن ہی سے بڑے ہونہار، ذہین وطباع تھے، اس لیے صرف تین سال کی عمر میں نورانی قاعدہ مکمل کرلیا تھا، ساتھ ہی چالیس حدیثیں زبانی یاد کرلی تھیں۔ جب ان کے والد صاحب کا دہلی ٹرانسفر ہوا، تو مولانا مرحوم مدرسہ تجوید القرآن، آزاد مارکیٹ (دہلی) کے شعبۂ حفظ میں داخل کیے گئے۔ جہاں سے ۱۹۸۸ء میں صرف آٹھ سال کی عمر میں حفظ وتجوید کی سند حاصل کی۔

مولانا مرحوم کے ہم مزاج ماموں مولانا مکین اشرف صاحب ندوی (مقیم دبئی) کا بیان ہے کہ جس وقت (مولانا) غزالی مدرسے میں داخل ہوئے، میں بھی اس وقت اس مدرسے میں حفظ کا طالب علم تھا۔ (مولانا) غزالی، مدرسے کے سب سے کم سن طالب علم تھے۔ اس وقت مدرسے کے مہتمم قاری سلیمان صاحبؒ ہوا کرتے تھے، جو بڑے اللہ والے تھے۔ وہ (مولانا) غزالی سے بڑی محبت فرماتے تھے۔ اس زمانے میں قرآن کا سائز عام طور سے بڑا ہوا کرتا تھا، کم سنی کی وجہ سے غزالی قرآن بھی نہیں اٹھا پاتے تھے۔ قاری صاحب نے ایک بچے کو متعین کر رکھا تھا جو ان کے قرآن کو لاتا اور لے جاتا تھا۔

پھر وہ معہد دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کے مکتب چہارم میں داخل ہوئے؛ لیکن بیماری کی وجہ سے بہت دنوں تک وہاں تعلیم جاری نہ رکھ سکے، اور اپنے نانیہال آ گئے جہاں اپنے بڑے ماموں مولانا محمد امین اشرف قاسمی صاحب کے قائم کردہ مدرسے، ادارہ دعوۃ الحق میں پڑھنے لگے۔ ادارہ دعوۃ الحق میں اس وقت دو اساتذہ کی بڑی شہرت تھی۔ اور وہ دونوں، طلبہ اور ادارے کے حق میں انتہائی مفید ثابت ہوئے۔ ایک شخصیت تھی مولانا عبدالرزاق صاحب قاسمیؒ کی، جو چند سال پہلے ایک دردناک سڑک حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ اللہ انھیں غریق رحمت کرے۔ (آمین) اور دوسری شخصیت تھی مولانا حافظ محمد رزین اشرف صاحب ندوی کی، جو ۱۹۹۴ء سے پونے (مہاراشٹر) کی سرزمین پر آسمان علم و فضل کا خورشید تاباں بنے ہوئے ہیں۔ اللہ انھیں لمبی عمر عطا فرمائے، اور ان کے چشمۂ فیض سے امت کو خوب سیراب کرے۔ (آمین)

ان دونوں اساتذہ کی مولانا مرحوم پر شفقت کی نظر تھی۔ خاص کر اپنے ماموں مولانا محمد رزین اشرف صاحب ندوی کے چشمۂ علمی سے خوب سیراب ہوئے، اور انھی کے دامن تربیت میں پرورش پائی۔ ابتدائیہ اور اعدادیہ کے دو سال دو سال انھی کے زیر سایہ مکمل کیے۔ اس طرح ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۱ء کا زمانہ مولانا کا بہار میں گزرا اور خوب گزرا؛ کیوں کہ آئندہ کی تعلیمی زندگی کے بہار میں بہار کی ابتدائی تعلیم کا بڑا اثر رہا۔

ثانوی تعلیم: ۱۹۹۲ء کا سنہ تھا کہ وہ علم فضل اور اخلاص وللّٰہیت کی بستی، تکیہ کلاں، رائے بریلی آ گئے، اور مدرسہ ضیاء العلوم میں ثانویہ رابعہ میں داخلہ لیا۔ عالیہ اولی (۱۹۹۴ء) تک اسی ریاض علمی میں مصروف گل چینی رہے۔ اور ایک ذہین وممتاز طالب علم کی حیثیت سے اساتذہ وطلبہ کے محبوب نظر بنے رہے۔

اعلی تعلیم: ۱۹۹۵ء میں انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلما جیسی عالمی دانش گاہ کا رخ کیا اور وہاں کی علمی وادبی، اصلاحی ودعوتی، تہذیبی وثقافتی فضا سے بقدر توفیق فائدہ اٹھانے کے بعد ۱۹۹۷ء میں عالمیت کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد تخصص فی الحدیث کے ارادے سے ندوۃ العلما کے کلیۃ الشریعہ میں ۱۹۹۸ء میں داخلہ لیا۔

حفظ وتجوید کے عالمی مسابقے میں شرکت:

نومبر ۱۹۹۸ء ہی میں وزارۃ الشؤون الاسلامیہ والاوقاف والدعوۃ والارشاد (سعودی عرب) کے زیر انتظام منعقد ہونے والے حفظ وتجوید کے بیسویں انٹرنیشنل مسابقے میں شرکت کر کے نام روشن کیا اور اندرون کعبہ نماز ادا کرنے کی سعادت پائی۔

موریشس میں: ابھی تخصص کا سال مکمل بھی نہ کیا تھا کہ ۱۹۹۹ء

میں وہ موریشس چلے گئے ،اور ایک مسجد واسکول سے وابستہ ہوکر قوم وملت کی خدمت میں مصروف ہوگئے ۔۲۰۰۰ء میں دوبارہ دارالعلوم ندوۃ العلما آئے اور فضیلت کا سال مکمل کیا۔اس کے بعد پھر موریشس چلے گئے اور۲۰۰۲ء تک وہاں خدمت انجام دیتے رہے ۔موریشس کے زمانۂ قیام میں انھوں نے انگریزی زبان پر اچھی قدرت حاصل کرلی تھی۔

دبئی میں: ۲۰۰۳ء کا ذکر ہے کہ مولانا مرحوم کے ماموں وخسر محترم ،کئی اہم کتابوں کے مصنف ،مشہور اور صاحب نسبت بزرگ عالم دین حضرت مولانا مفتی محمد ثمین اشرف صاحب قاسمی دامت برکاتہم کی ایما پر وہ دبئی آ گئے ، اور خوانیج کے علاقے میں واقع مسجد الحسبتو ر سے بحیثیت امام وخطیب وابستہ ہوگئے ۔۲۰۰۳ء سے ۲۰۰۹ء تک وہیں خدمت انجام دیتے رہے۔

دبئی میں قیام کے دوران مولانا نے منتخب کتابوں کا ایک قیمتی ذخیرہ خرید کر جمع کیا،جن میں سے بیشتر حدیث اور متعلقات حدیث سے تعلق رکھتی ہیں۔اورصرف ''صاحب تاب'' بننے پر اکتفانہیں کیا؛ بلکہ '' کتاب خواں''بن کر ان کتابوں کے مغز اور جوہر کو اپنے دماغ میں اچھی طرح محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ مجھ سے ایک بار خود فرمایا: ''دبئی کے زمانے میں مجھے اپنے مطالعے کو وسعت دینے کا اچھا موقع ملا''۔اس لیے جولوگ یہ کہتے یا سمجھتے ہیں کہ فراغت کے بعد کے چندسال مولانا کے ضائع ہوگئے ،میرے نزدیک یہ تجزیہ درست نہیں۔میرا تو یہ خیال ہے کہ یہ عرصہ بھی ان کا بڑا قیمتی رہا،جس نے آئندہ کی علمی وتحقیقی،دعوتی واصلاحی اور تربیتی وتدریسی زندگی میں ان کا بڑا ساتھ دیا۔

نکاح: ۲۰/ جولائی ۲۰۰۳ء کو ماموں زاد بہن سے عقد مسنون ہوا۔

علی گڑھ آمد اور مدرسۃ العلوم الاسلامیہ سے وابستگی:

۲۰۰۹ء کے اواخر میں وہ علی گڑھ تشریف لے آئے ، کچھ دنوں تک اسٹیشنری کی دوکان کے ذریعے کسب معاش کے ساتھ لوگوں کو تجارت کے اسلامی اصول وآداب بھی سکھائے ۔لیکن جلد ہی اللہ تعالی نے ان کو تعلیم وتدریس اور خلق خدا کو نفع پہنچانے کے لیے چن لیا۔اس طرح وہ ۲۰۰۹ء ہی سے مدرسۃ العلوم الاسلامیہ،علی گڑھ (شاخ ندوۃ العلما،لکھنؤ) میں تدریس سے جڑ گئے اور وہاں کے مقبول وکامیاب اور ہردل عزیز استاذ کی حیثیت سے نیک نام ہوئے۔اخیر زمانے میں انتظامیہ کی طرف سے کچھ ذمے داریاں بھی انھیں سونپی گئیں اور نائب مہتمم بھی بنائے گئے۔

امام بخاری ریسرچ اکیڈمی کا قیام: جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں برج کورس کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے ڈاکٹر راشد شاز صاحب کو لایا گیا،اور ان کے ملحدانہ افکار وخیالات سے علی گڑھ کی فضا خاص طور سے متاثر ہونے لگی،تو مولانا اور ان کے دیرینہ رفیق جناب ڈاکٹر طارق ایوبی ندوی صاحب حرکت میں آئے ،اور ان کے فکری انحرافات وتلبیسات کا پردہ چاک کرنے میں ہراول دستے کا کام کیا۔لیکن مولانا مرحوم کا خیال تھا کہ یہ جڑ گرفتہ فتنہ ایک دومضمون سے اکھڑ نہیں سکتا، اس کے لیے منظّم ،مسلسل،مثبت اور پائیدار کوشش کرنے کی ضرورت ہے ۔ اس حوالے سے ان کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جو دفاع دین اور تحفظ شریعت کا کام مضبوطی سے سکے۔اسی فکر وخیال نے مولانا مرحوم سے امام بخاری ریسرچ اکیڈمی کے نام سے ایک علمی وتحقیقی ادارے

کی بنیاد ڈلوائی، اور ۲۵/ جولائی ۲۰۱۶ء سے باضابطہ چند رفقا کے ساتھ مولانا نے ایک منصوبے کے ساتھ کام کا آغاز کیا، جو ابھی زیر تکمیل ہے۔

اس قلیل مدت میں اکیڈمی سے آٹھ کتابیں شائع ہوئیں: (۱) بدلتا ہندوستان۔ (۲) قرض کے آداب۔ (۳) عفو و درگذر۔ (۴) فقہی مسالک اور حدیث نبوی ﷺ۔ (۵) تحفۂ رمضان۔ (۶) قطر الندی کوئز۔ (۷) جو تم کچھ بننا چاہو۔ (۸) ممارا قتی۔

زیر ترتیب کتابیں مندرجہ ذیل ہیں: (۱) موجودہ اہل کتاب شریعت اسلامی کی نظر میں۔ (یہ مولانا مرحوم کی ایک وقیع، علمی اور تحقیقی تصنیف ہے، جس کی تیاری میں مولانا نے تقریباً پانچ برس صرف کیے ہیں، ان شاء اللہ بہت جلد زیور طبع سے آراستہ ہوکر اسلامی کتب خانوں میں وقیع اضافے کی حیثیت رکھے گی (۲) فتنۂ انکار حدیث: تاریخ وتجزیہ اور شکوک وشبہات کا ازالہ۔ (۳) نظریۂ وحدت ادیان: تعارف وتاریخ۔ (۴) حجیت حدیث۔ (۵) کیا شریعت اسلامی دائمی اور کامل نہیں ہے؟ (۶) زہد کا اسلامی تصور۔ (۷) ہدایہ کوئز۔ (۸) اسلامی عقائد۔ (۹) اسلام کا اخلاقی پہلو۔ (۱۰) نقوش غزالی (مولانا مرحوم کے متفرق مضامین کا مجموعہ) (۱۱) الجہاد فی ضوء الأحادیث النبویۃ) یہ مولانا مرحوم کے تخصص کا مقالہ ہے، جسے انھوں نے حضرت مولانا سید سلمان حسینی ندوی دامت برکاتہم کے اشراف میں تیار کیا تھا)۔

ہفت روزہ الجمعہ میگزین کا اجرا: عوام کی اصلاح کے مقصد سے ایک ہفتہ وار میگزین ۲۶/جنوری ۲۰۱۸ء کو جاری کیا جو الجمعہ کے نام سے ہر ہفتے پابندی سے اردو اور ہندی میں شائع ہوتا ہے، اور مسلمانوں کے عقائد واخلاق کو درست کرنے، ان کے دلوں پر دستک دینے کا کام کرتا ہے، ساتھ ہی ان کو دین کی بنیادی معلومات اور ضروری مسائل سے واقف کراتا ہے۔ الحمدللہ اس چھوٹے سے میگزین کو اللہ نے بڑی قبولیت سے نوازا، اور اس کا فیض دور تک پہنچایا۔ اللہ کرے یہ مسلسل اپنی منزل کی طرف محو سفر رہے، اور کبھی تعب وتھکن سے آشنا نہ ہو۔

وفات: ۱۰/شوال ۱۴۴۰ھ مطابق ۱۴/ جون ۲۰۱۹ء بروز جمعہ، حرکت قلب بند ہوجانے سے، زندگی کی صرف ۳۸ بہاریں دیکھنے کے بعد مولانا اللہ کو پیارے ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کس قدر غم ناک ہے یہ سانحہ
جرعہ جرعہ، زہر غم کو پیجیے

تدفین: مولانا کے جنازے میں ہر طبقے کے لوگوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ مقامی لوگوں کا تبصرہ یہ تھا کہ ایک مدت کے بعد کسی کے جنازے میں اس قدر بھیڑ دیکھی گئی۔ نماز جنازہ ان کے خسر محترم مولانا مفتی محمد ثمین اشرف قاسمی صاحب نے پڑھائی، اور شوکت منزل قبرستان، علی گڑھ میں تدفین عمل میں آئی۔

پسماندگان: پسماندگان میں والدین، اہلیہ، تین بچے: عمر، انس، سعد، ایک بچی: حفصہ اور چار بھائی: محمد خوشنود رومی، محمد فہمود جامی، فصیح الرحمٰن رازی اور مہدی حسن شبلی ہیں۔ اللہ ان سب کو صبر جمیل عطا فرمائے، اور دنیا وآخرت کی سعادتوں سے نوازے۔ (آمین)

☆☆☆

❑ نقوش و تاثرات

آہ! اے دوست تجھے کیا لکھوں.....

رفیق محترم صدیقِ مکرم محمد غزالی ندویؒ کا سانحۂ ارتحال

(۷/ نومبر ۱۹۸۰ء — ۱۴/ جون ۲۰۱۹ء)

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

بہت کم مواقع میری زندگی میں ایسے آئے جب کہ مجھے سوچنا پڑا کہ میں کیا لکھوں، کہاں سے ابتدا کروں، کہاں سے الفاظ لاؤں اور کن کن خوبیوں کا تذکرہ کروں، برادر گرامی محمد غزالی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا سانحۂ ارتحال کچھ اسی طرح کا کربناک واقعہ ہے جس کے بعد فکر کو بے بسی اور قلم کو قحطِ الفاظ کا شکوہ ہے، قلب و ذہن پر اس خوبرو، شیریں دہن، خوش مذاق وخوش مزاج، مخلص دوست، خیر خواہ بھائی، ہمدم وہم ساز، رفیق کار، باعمل عالم، کامیاب استاد، با صلاحیت اسکالر اور بہت مخلص انسان کے جانے اور ان کی جگہ خالی ہو جانے کا ایسا اثر ہے جس کے اندمال کی فوری طور پر کوئی شکل ممکن نظر نہیں آتی۔

دنیا میں کسی کا آنا انسانی نقطۂ نظر سے نامعلوم اور غیر متعین ہے، مگر جو ایک بار دنیا میں آجائے اس کا جانا بالکل یقینی اور طے شدہ ہے، کب جائے گا اور کیسے جائے گا اس کی بھی کوئی تعیین نہیں، لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ بعض لوگوں کے جانے کا بہت دنوں تک یقین نہیں آتا، ان کی یادیں ہمہ وقت کچوکے لگاتی رہتی ہیں، ان کے جانے کا خلا دور دور تک محسوس کیا جاتا ہے، غزالی بھائی کے جانے کا اثر ہر اس شخص پر تھا جو ان سے ایک آدھ بار ملا تھا، ان کے جنازے میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جنھوں نے صرف ان کے بارے میں سنا تھا، اسے اتفاق کہیے کہ ۱۶/ جون کو ہم سب غزالی بھائی سے متعلق تعزیتی نشست میں مصروف تھے عشاء کے بعد فارغ ہو کر جب موبائل دیکھا تو صدر مصر حافظ محمد مرسی کے انتقال پر تعزیتی پیغامات کی بہتات تھی، ان کے انتقال کا دنیا کے ہر خطہ میں اثر محسوس کیا جا رہا تھا، درحقیقت جو جس قدر مفید ہوتا ہے، جس کی نفع رسانی جس قدر عام ہوتی ہے، جس کی شخصیت جس قدر اہم ہوتی ہے اس کی کمی اسی قدر محسوس کی جاتی ہے، اس کے جانے سے اسی قدر اثر پڑتا ہے، غزالی صاحب کی شخصیت اس ادارے کے لیے ہی نہیں بلکہ اس شہر کے لیے اپنی فکری سلامتی، علمی توسع اور تقوی و تدین کے سبب بڑی اہمیت کی حامل تھی، ان کے حلقۂ اثر کی وسعت کا راز ان کے انتقال پر کھلا، ان کے جانے سے ان کے اہل خانہ، والدین اور بھائی سب متاثر ہوئے، اہل محلّہ کی وارفتگی اور ان کا تاثر دیدنی تھا، ان کے اعزہ، اقربا پر بڑا اثر تھا، کمزوروں اور بے سہاروں کا ایک بڑا طبقہ آنکھوں میں آنسو لیے کھڑا تھا، ان سے مشورے لینے والے کفِ افسوس مل رہے تھے، ان کے رفقاء، یار واحباب، طلبہ اور ہم جیسے سینکڑوں لوگ آج تک ان کی کمی کے احساس سے باہر نہیں نکل پائے ہیں، بلکہ ان کی خوبیاں ایسی تھیں کہ مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ انھیں۔

میں ہمیشہ عیدالفطر اپنے والدین کے ساتھ اپنے گاؤں میں کرتا ہوں، گذشتہ تقریباً ۱۵/سالوں سے یہی وہ موقع ہوتا ہے جب میں دس بارہ روز اپنے گاؤں میں اپنے والدین کے ساتھ گذارتا ہوں، ۱۴/جون بروز جمعہ کوئی دس بجے میں اپنے گھر سے نکلا، ارادہ تھا کہ ندوے میں جمعہ کی نماز پڑھوں گا پھر علی گڑھ کے لیے نکل جاؤں گا، ابھی کوئی بیس پچیس کلومیٹر کا سفر طے ہوا تھا کہ برادرعزیز فرید حبیب کا فون پہنچا، عادت کے مطابق میں نے انتہائی بے تکلفی اور دوستانہ لہجہ میں سلام کیا، مگر ان کے منہ سے نکلا ''یار مولانا بہت بری خبر ہے'' کیا ہوا؟ چیختے ہوئے میں نے کہا، جواب تھا ''مولانا غزالی صاحب کا انتقال ہوگیا'' ہم نے کہا ''کیا! کون سے غزالی صاحب''، وہم وگمان میں نہ تھا کہ ہمارے دوست ورفیق کار غزالی اتنی جلدی رخصت ہوجائیں گے، مگر یہ تو دل کو بہلانے کی باتیں ہیں، موت کا آنا طے ہے، اس کا وقت مقرر ہے، اسی کے مطابق اسباب بھی بن جاتے ہیں، غزالی صاحب کی عمر اتنی ہی مقرر کی گئی تھی، ان سے اللہ کو اسی قدر کام لینا تھا، وہ اپنی عمر مکمل کرچکے تھے، اپنے حصے کا کام کرچکے تھے، اب ان کو جانا ہی تھا، یہی ایک مسلمان کا عقیدہ ہونا چاہیے اور زبان سے اسی کا اظہار ہونا چاہیے، البتہ میں نے ان کو جس قدر دیکھا اور جتنا دیکھا اور آخری سالوں میں ساتھ کام کرنے کا جو موقع ملا اس کے بموجب یہ شہادت دے سکتا ہوں کہ انھوں نے زندگی کی امانت کا حتی المقدور پوری دیانت کے ساتھ حق ادا کیا، ان کے لیے کہا جاسکتا ہے طبت حیا و طبت میتا، مجھے امید ہے کہ جو بھی ان سے ملا ہوگا وہ ہماری اس شہادت کی تصدیق وتائید کرے گا۔

غزالی بھائی کا انتقال کئی وجوہات کی بنا پر میرا ذاتی نقصان اور ذاتی غم ہے، جب آدمی کسی چیز کو بہت زیادہ محسوس کرے تو پھر مرتب گفتگو، منظم مضمون اور اچھی ساخت وسانچہ میں ڈھلی تعبیرات سے مزین مضمون لکھنا مشکل ہوتا ہے، سوچ سوچ کر دوسروں کے اشعار سے بتکلف اپنے غم کا اظہار کبھی میری عادت نہ رہی، جو کچھ نوکِ قلم سے خود ہی ٹپک پڑے وہی جذبات واحساسات کا حقیقی آئینہ ہوا کرتا ہے، شدید تاثر کی بنا پر میرے قلم سے جو جملے بلا ارادہ ان کے انتقال کے موقع پر نکل گئے تھے وہی دراصل میرے حقیقی جذبات و احساسات اور تاثرات ہیں، میں یہاں انھیں من وعن نقل کیے دیتا ہوں۔

''اے دوست تجھے کیا لکھوں، لکھوں تو لکھتا چلا جاؤں مگر دل کو قرار آئے تب تو لکھوں۔ تیری یادیں لکھوں یا تیری باتیں لکھوں، تیرے قہقہوں کا ذکر کروں یا مسکراہٹ بکھیرتے چہرے کا وصف لکھوں، تیری محبت، فنائیت، اپنائیت، بے لوثی، بے نفسی، کسر نفسی، سادگی، تواضع اور للّٰہیت کا ذکر کروں یا زاہدانہ عادات واطوار اور عالمانہ شان کا تذکرہ کروں، تیری حوصلہ افزائی، دلجوئی، جذبۂ تعاون، قدردانی، مولویانہ تنگ نظری اور بے اصولی سے تنفر کا ذکر کروں یا تیرے خیر خواہانہ جذبہ اور مخلصانہ مشوروں کو یاد کروں، یا پھر یا پھر.....اے دوست سمجھ میں نہیں آتا کہ تیری زندگی کو کیا عنوان دوں، تیری زندگی کے کس پہلو کا قصہ چھیڑوں، دوست غزالی بہت جلدی چل دیے تم، قدرت کا فیصلہ یہی تھا جس سے کسی کو رستگاری نہیں، مگر دوست مجھے یقین ہے تمہارا بیٹا عمر انشاء اللہ تمہارا سچا جانشین ہوگا اس پر تمہارے بچپن کا مکمل رنگ ہے۔

بچپن کے معصوم ایام تھے، ۱۹۸۹ء میں چہارم معہد میں ہم تم ساتھ ہوئے مگر جلد ہی تم واپس چلے گئے، پھر دوبارہ تم آئے تو سینئر بن کر آئے پھر ملاقاتوں کا وہ سلسلہ بھی نہ رہا، پھر دنیا کے سمندر میں سب گم ہوگئے، جب جوانی ڈھلنے لگی تو عرصہ

دراز کے بعد تمہاری پاکیزہ رفاقتیں نصیب ہوئیں، مجھے آج بھی ۲۰۰۷ء کا وہ دن یاد ہے جب میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طالب علمی کے دور میں چند گھنٹوں کے لیے مدرسۃ العلوم الاسلامیہ پڑھانے آتا تھا، ایک روز تم اپنے ابو جان کے ساتھ ڈاکٹر صاحبؒ سے مدرسہ میں تدریس کی خاطر بات کرنے آئے تھے، اچانک دسیوں سال بعد دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا، مگر بے ساختہ دونوں کی زبان سے نکلا تھا ''آپ غزالی، آپ طارق ایوبی'' اور پھر دونوں دیر تک ایک دوسرے سے چمٹے رہے تھے اور تمہارے ابّو یہ منظر دیکھ کر پاس کھڑے مسکراتے رہے تھے، آج تم ہم سب کو چھوڑ گئے، آج تمہارے ابا ہم سب سے مل مل کر بلک رہے ہیں۔

غزالی بھائی تم اپنی خوش خلقی، بلند اخلاقی اور پاک دلی کے سبب بہت یاد آؤ گے، قدم قدم پر یاد آؤ گے، تمہاری سوجھ بوجھ یاد آئے گی، تمہاری رفاقت، تمہاری تواضع اور قدر دانی کے سبب بڑی نعمت تھی ورنہ کہاں تمہاری اخلاقی اور علمی بلندی اور کہاں اس عاجز و ناتواں کی بے مائیگی ''أین الثری من الثریا''.

واقعہ یہ ہے کہ غزالی بھائی بڑی خوبیوں کے مالک تھے، کم اور بہت کم علماء اور بالخصوص نوجوان علماء میں ان کے جیسی اخلاقی بلندی اور علمی گہرائی ہوتی ہے، اب دن آئے تھے ان کا افادہ عام ہونے اور ان کی شخصیت کے نکھرنے اور منظر عام پر آنے کے، مگر کسے خبر تھی کہ ان کی زندگی کا سورج بھی لب بام آ چکا تھا، فون وغیرہ سے وہ اکثر بے نیاز رہتے اور گھریلو مصروفیات بھی ان کی بہت تھیں، اس لیے بسا اوقات وہ فون کا جواب ایک دو دن بعد بھی دیتے، اور فون تو بہت کم ہی ریسیو کر پاتے، جب وہ فون نہ اٹھاتے تو ملاقات پر میں اکثر ان سے کہتا کہ یار کسی دن میں مر جاؤں گا، لوگ آپ کو فون کر کے اطلاع دینا چاہیں گے اور عادت کے مطابق فون اٹھے گا نہیں، اگلے روز جب آپ کو پتہ ہوگا تو انا للہ پڑھتے ہوئے، استغفار کرتے ہوئے ہاتھ ملیے گا بس! کس کو خبر تھی کہ وہ خود ہی سب کو ہاتھ ملتا چھوڑ جائیں گے، یہ بھی عجیب اتفاق رہا کہ جس دن مدرسہ بند ہو رہا تھا اسی دن اپنے چھوٹے بیٹے کے تکمیل قرآن کی خوشی میں انھوں نے سب کی دعوت کی اور جس دن مدرسہ کھلنے والا تھا عین اس سے ایک دن قبل دنیا کو خیر آباد کہہ دیا، میری اہلیہ سے ان کی والدہ نے بتایا کہ یہ بھی عجیب اتفاق رہا کہ غزالی کی ولادت بھی جمعہ کے دن دس بجے کے قریب ہوئی اور انتقال بھی اسی دن تقریباً اسی وقت ہوا۔

غزالی صاحب جیسی پختہ صلاحیت، علمی گہرائی، نصوص پر نظر، وسعت مطالعہ عموماً اب علماء میں کم ہوتی جا رہی ہے، اور اگر یہ سب یکجا ہو تو تواضع، شرافت اور وسعت ظرف کی نعمت کا بھی میسر ہونا بہت خال خال ہی نظر آئے گا، ان کو اللہ نے بلا کا حافظہ عطا کیا تھا، یہ بھی عجیب بات تھی کہ روزمرہ کی زندگی میں ان سے خوب نسیان کا مظاہرہ ہوتا مگر نصوص اور علمی نکات پر خوب گرفت تھی، برسرِ گفتگو برملا استدلال سے قوتِ حافظہ اور استحضار کا اندازہ بڑی آسانی سے ہو جاتا ہے، اب وہ دن آئے تھے کہ غزالی صاحب کا تذکرہ زباں زدِ عام و خاص ہوتا، اہل علم میں ان کے چرچے ہوتے مگر تقدیر الٰہی کا فیصلہ یہی تھا کہ وہ بھی ماضی قریب کے ان عبقری اہل علم کی صف میں شامل ہو جائیں جو عین جوانی میں اس دنیا سے چلے گئے، اور اہل دنیا یہی کہتے رہے کہ خدا نے ان کو جو صلاحیت دی تھی اگر کچھ اور عمر بھی دے دیتا تو وہ بڑا کام کر جاتے، مگر ظاہر ہے کہ یہ ہماری حسرتیں ہیں، رب کی مصلحتیں رب ہی جانے، غزالی صاحب کو لوگوں نے بہت دیر سے جانا، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ بہت سے لوگوں نے

اس ولی صفت، صاحبِ علم بندۂ خدا کو صحیح معنیٰ میں پہچانا ہی نہیں، اب لوگوں نے ان کو پہچاننا شروع کیا تھا، کیونکہ صحیح معنی میں اب انھوں نے کام کرنا شروع کیا تھا، ان کی زندگی کا ایک دور وہ تھا جو طالب علمی اور ندوہ سے فراغت کے بعد ملک سے باہر گذرا، تقریبا ایک سال ماریشس اور ۱۰/سال وہ دبئ میں رہے، میری نظر میں ان کی زندگی کے یہ بہترین ایام تھے، جو کسبِ معاش اور قیدِ تنہائی میں گذر گئے، البتہ اس دوران ان کو جو بڑا فائدہ ہوا، جس میں ان کے ذوق ومزاج کو بڑا دخل تھا وہ یہ کہ انھوں نے بہت کثرت سے مطالعہ کیا، دبئ جیسی جگہ میں ان کے پاس ان کی خریدی ہوئی کتابیں ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوگئیں، پھر کچھ حالات ایسے بنے کہ وہ غالبًا ۲۰۰۷ء/میں ہندوستان واپس آ گئے، مدرسۃ العلوم الاسلامیہ میں جز وقتی تدریس کا آغاز کیا، یہ سلسلہ چلتا رہا حتی کہ مئی ۲۰۱۱ء میں راقم سطور کو اہتمام کی ذمہ داری سپرد کی گئی، اس مدرسہ کی قسمت کہیے کہ اس کے بانی مرحوم نے اسے بڑے خلوص سے سینچا تھا، شبانہ روز محنتوں اور انتھک کوششوں سے وہ اس کو ایک شکل دینے میں کامیاب ہوئے تھے، مگر صد افسوس کہ مدرسہ پنپنے سے پہلے انتشار کا شکار ہو رہا تھا، انتظامی وتعلیمی انتشار سے خود اس کے بانی بڑے پریشان تھے، ان حالات میں راقم کو ذمہ داری دی گئی تو یقین جانیے قدم قدم پر غزالی بھائی کے سادہ اور مخلصانہ مشورے ملتے رہے، جلد ہی منتشر صورت حال پر قابو پایا گیا، ادارے میں خالص علمی وتعلیمی ماحول قائم ہوا، مگر اس پورے دورانیے میں غزالی بھائی کا تعلق جز وقتی رہا، اگر چہ وہ قلبی طور پر ہمہ وقت مدرسہ سے جڑے رہتے مگر مدرسہ سے باضابطہ کوئی انتظامی تعلق نہ تھا، اسی دوران مدرسہ میں رابطہ ادب اسلامی کا سیمینار ہوا، اگلے ہی سال عالمی کانفرنس ایسی ہوئی کہ اس کی نظیر تاریخ ہند میں ملنی مشکل ہے، فالحمد للہ علی ذٰلک، مجھے یاد نہیں کہ سال کون سا تھا مگر غالب گمان یہ ہے کہ ۲۰۱۳ء/میں غزالی بھائی سے میں نے بڑی منت سماجت کی، کہ یار آپ کل وقتی تدریس اختیار کر لیجئے، آپ جیسے، ماہر استاد اور کامیاب معلم کی اس دور میں طلبہ کو بڑی ضرورت ہے، دراصل غزالی بھائی کی گھریلو مصروفیات بہت زیادہ تھیں، انھوں نے اپنے والدین کی تمام ذمہ داریوں کو اوڑھ رکھا تھا، ان کی خدمت اور ان کی ہر چھوٹی بڑی ضرورت کا خیال رکھتے تھے، اس کے علاوہ ان کے یہاں ہر کام اور ہر ایک کے حق کا علیٰحدہ خانہ تھا، وہ اہل محلّہ کو بھی وقت دیتے، والدین کو بھی وقت دیتے، احباب کو بھی وقت دیتے، راہ چلتے انھیں کوئی بھی روک کر کھڑا ہو جاتا، سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اپنے بچوں کی تربیت پر پوری توجہ دیتے، عام طور پر اس طرح کے مصروف لوگ بالخصوص مولوی حضرات اپنے بیوی بچوں کے حقوقِ تربیت سے غافل رہتے ہیں، غزالی بھائی بچوں کی نفسیات کے حساب سے ان کا بھرپور خیال رکھتے، ان کی صحت، تعلیم، تفریح اور مطالعہ ہر چیز کا خیال رکھتے، ان کو کبھی اپنے ہاتھوں سے کھلاتے، کبھی ان سے کھیلتے، کبھی ان سے گفتگو کرتے، تربیت میں نفسیاتی اصولوں کا بہت کم لوگ خیال رکھتے ہیں، مگر ان کا کمال تھا کہ وہ ہر چھوٹی بڑی چیز کو اس زاویہ سے پرکھ کر عمل میں لاتے، ان تمام چیزوں کے ساتھ انھوں نے جز وقتی تدریس اور اس کے ساتھ اسٹیشنری کی ایک دکان بھی کر رکھی تھی، جو پہلے امیر نشاں کی ایک مارکیٹ میں تھی، پھر گھر کے ہی باہری کمرے میں منتقل ہوگئی اور رفتہ رفتہ ختم ہوگئی، یہی وہ اسباب تھے جو ان کی کل وقتی تدریسی وعلمی زندگی میں دخیل تھے، بہر حال انھوں نے میری درخواست قبول کی اور غالبًا ۲۰۱۴ء/میں انھوں نے کل وقتی تدریس کی ذمہ داری

سنبھالی، میں اپنے اہتمام کے ابتدائی دور میں جب چھٹی لیتا تو عام طور پر مولانا تجمل صاحب کو یہ ذمہ داری دے کر جاتا یا کبھی غزالی بھائی یا کبھی کسی اور کو، مولانا تجمل صاحب کے جانے کے کچھ دنوں بعد میں نے ہمیشہ یہ ذمہ داری غزالی بھائی کے سپرد کرنا شروع کر دیا، حتی کہ بدون تعیین وہ ہمیشہ مدرسہ کے نائب مہتمم رہے، ڈاکٹر صاحب مرحوم کے بعد ادارے کے انتظام سے ان کا تعلق بہت زیادہ بڑھ گیا جس کو انھوں نے بڑی خوبی سے نبھایا، بلکہ یوں کہیے کہ جس طرح انھوں نے نبھایا شاید کسی اور کے بس میں نہ تھا۔ ۲۰۱۶ء میں جب ان کے مکان کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا تو پھر وہ جزوقتی مدرس ہوگئے البتہ اب وہ انتظامی طور پر مکمل شریک رہے، ابھی شعبان کی بات ہے ان پر پھر کوئی تجارت شروع کرنے اور معاشی طور پر کچھ کرنے کا بڑا غلبہ تھا، اس کے لیے انھوں نے کہہ دیا تھا کہ آئندہ برس ''میں صرف صبح کے دو گھنٹے پڑھانے آؤں گا''، میں نے بہت اصرار کیا مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے۔

اس پورے دورانیے میں ان کی جو بات قابل غور سامنے آئی اور جو سب کے لیے لائق درس بھی ہے، وہ یہ کہ غزالی صاحب میں نام ونمود کی بلکہ معاصر زبان میں کہیے تو اپنے آپ کو ایکسپوز کرنے کی ادنیٰ سی خواہش نہ تھی، وہ اپنے کمالات اور خوبیوں کا تذکرہ تحدیثِ نعمت کے طور پر بھی کرنے سے گریز کرتے تھے، ان کے ماموں مولانا رزین اشرف ندوی صاحب نے بتایا کہ غزالی کو ایک کتاب مولانا علی میاںؒ صاحب کی ندوے میں انعام میں ملی، وہ لے کر مولانا کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا کہ حضرت اس پر اپنے قلم سے کچھ لکھ دیجئے، مولانا نے نام پوچھا اور پھر دعائیہ کلمات میں لکھا کہ اللہ آپ کو غزالی زماں بنائے، انھوں نے بعض مرتبہ حضرت مولانا کی بعض چیزوں کا املا بھی لکھا لیکن باہمی گفتگو اور کسی مجلس میں بھی ان چیزوں کا تذکرہ تک نہ کیا، ان کی بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ وہ ہمیشہ خود کو پیچھے رکھتے تھے اور دوسروں کو آگے بڑھاتے تھے، دوسروں کی حوصلہ افزائی اتنی زیادہ کر دیتے تھے کہ آدمی کم ظرف ہو تو اپنی کم علمی کے باوجود خود کو علامہ سمجھنے لگے، ابتدائی سالوں میں تو زیادہ تر خاموش رہتے، مجلس میں بھی بہت کم کھلتے، ان کی اس خاموشی اور کم گوئی میں ان کی عملی زندگی کے دور اول کا خاص اثر تھا جس کے متعلق کئی مرتبہ ان کے والد محترم سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ آخری سالوں میں غزالی بھائی نے جس انداز سے کام کرنا شروع کیا تھا اور جس طرح ان کو مقبولیت حاصل ہو رہی تھی، مدرسہ سے منسلک ہونے کے بعد ان کے اندر جو نمایاں تبدیلیاں آئی تھیں ان سے خاص طور پر ان کے والدِ محترم بہت مطمئن اور خوش تھے، رفتہ رفتہ اجتماعیت میں کھلتے بھی گئے اور کھلتے بھی گئے، آخری سالوں میں تو وہ رنگِ محفل اور مرکز توجہ ہوا کرتے تھے، کوئی محفل ہو، کوئی موضوع ہو مگر اپنی خوش مذاقی سے وہ گرمیٔ محفل میں اضافہ کر دیتے، اللہ کا شکر ہے کہ راقم کو اعترافِ حقیقت اور صلاحیتوں کے تعارف میں کبھی جھجک نہیں ہوتی، زیادہ تر باتیں منہ پر کہہ دینے کی عادت ہے جو اس دور تصنع میں بڑا عیب سمجھا جاتا ہے، اسی طرح مبالغہ آمیزی اور بھر بھر کے جھوٹی تعریف جو تملّق کے زمرے میں آجائے اس سے نہ صرف یہ کہ انسیت نہیں بلکہ نفرت ہے، میں اکثر و بیشتر غزالی بھائی سے کہتا کہ یار آپ کی سی صلاحیت اگر مجھے مل جائے تو بہت کچھ کر ڈالوں، میں نے بار بار نجی اور اجتماعی مجلسوں میں ان کی پختہ اور اعلیٰ علمی استعداد کا اعتراف و اظہار کیا، اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ صحیح اور سچی بات لوگوں کے سامنے آنا چاہیے تاکہ غزالی بھائی کی علمی

صلاحیت کا نفع عام ہو سکے، مدرسہ کی اس مدت کار میں بالخصوص تب جبکہ غزالی بھائی بالکل دور دور اور خاموش رہتے، جب بھی کوئی مہمان آتا، کسی اہل علم کی آمد ہوتی، خاص طور پر اگر وہ غزالی بھائی سے واقف نہ ہوتا تو میں ان کا اور عزیز القدر مفتی عامر مظاہری کا بھرپور تعارف کراتا اور مہمیز کرتا، بالخصوص غزالی بھائی کا ان کے سامنے اس طرح تذکرہ کرتا کہ یہ بڑے صاحب علم، بڑی اعلیٰ صلاحیت کے مالک، عربی، اردو اور انگریزی پر یکساں قادر ہیں، مگر یہ کچھ لکھتے نہیں ہیں، ان سے کہیے کہ اپنا افادہ عام کریں، جب بھی ایسا موقع آتا تو پورے دورانیے میں وہ ہنستے مسکراتے ''جی جی'' کہتے رہتے اور استغفر اللہ پڑھتے رہتے، واقعہ یہ ہے کہ راقم کو غزالی بھائی اور عامر مظاہری جیسے عین جوانی میں ولی صفت علماء دیکھنے کو نہیں ملے، دونوں اپنے اخلاص، صدق وامانت داری، زہد وتقویٰ، للّٰہیت و مرجعیت، بے مثال جذبۂ تعاون، حرام سے اجتناب، حلال کی فکر، جھوٹ، غیبت اور چغل خوری جیسے عام امراض سے بچنے میں ممتاز، یہ الگ بات کہ علمی وفکری حیثیت سے مولانا غزالی ندوی مرحوم مفتی عامر مظاہری سے بدرجہا بلکہ بہت فائق تھے، ایک اور فرق تھا کہ غزالی بھائی ناپسندیدہ امور یا بے اصولی پر نکیر کم کرتے، بڑی خوش اسلوبی سے دامن بچا کر ٹال جاتے، البتہ عامر صاحب غلط بات ایک لمحہ کے لیے برداشت نہیں کرتے، بغیر بولے انھیں چین نہیں پڑتا، بعض مرتبہ ہزار خوبیوں کے باوجود صاف گوئی کا یہ عنصر انسان کی مقبولیت میں اچھے اچھے لوگوں کے یہاں مانع ہوتا ہے، غزالی بھائی کی شرافت کا یہ عالم تھا کہ میں ان سے کبھی کبھی کہتا کہ آپ ضرورت سے زیادہ سیدھے ہیں، آپ کی ضرورت سے زیادہ شرافت وتواضع کبھی کبھی نقصان دہ ہوتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ جب وہ سامنے والے کو دیکھتے کہ اپنے مزاج کے مطابق بات منوانا ہی چاہتا ہے تو یا تو وہ خوش اسلوبی سے ٹال جاتے یا خاموش ہو کر کنارے ہو جاتے، وہ اس قدر متواضع تھے کہ بہت سے لوگ ان سے اپنا کام نکال لیتے اور وہ جذبہ خیر خواہی میں کر دیتے، سامنے والا سمجھتا کہ گویا یہ اتنے سیدھے ہیں کہ سمجھ ہی نہیں رہے ہیں لیکن یہ اس کی بھول ہوتی تھی۔ بقیہ بہت سے امور میں، مکارم اخلاق، وجوہ خیر اور اعلیٰ صفات میں دونوں ایک سے بڑھ کر ایک، غزالی بھائی تو اپنی آخری منزل پر پہنچ گئے عامر بھائی بقید حیات ہیں مگر ان کو امراض نے مدرسے سے جدا کر دیا، تمام قارئین سے درخواست ہے کہ وہ جہاں غزالی صاحب کے لیے مغفرت و بلندی درجات کی دعائیں کریں وہیں عامر بھائی کے لیے صحت وسلامتی اور عافیت کی دعائیں کریں، ایسے نیک افراد صرف اپنے گھر خاندان اور اپنے اداروں کے ہی نہیں بلکہ امت کا سرمایہ ہوتے ہیں، ان کی دعائے نیم شبی اور آہ سحرگاہی میں امت کا، امت کے تمام افراد و اداروں کا تذکرہ ہوتا ہے، یہی وہ دعائیں ہیں جو تمام تر نقائص کے باوجود اداروں اور امت کی تقویت کا باعث ہیں۔

بہرحال بات چل رہی تھی غزالی بھائی کے نام ونمود سے بہت دور ہونے کی تو واقعہ یہ ہے کہ ان میں جس قدر صلاحیت تھی اس کا عشر عشیر بھی اگر آج کے مزاج کا لازمی عنصر یعنی ایکسپوز کا شوق شامل ہوتا تو وہ ملک بلکہ ملک سے باہر اپنی علمی شہرت رکھتے، اسلامی غیرت اور دینی حمیت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی، کبھی کبھی مجلس میں کلامی بحثیں بعض ساتھیوں سے چھڑ جاتیں تو مارے غیرت کے بات کرتے کرتے وہ کھڑے ہو جاتے اور آواز قدرے بلند ہو جاتی، مسلّمہ عقائد میں وہ کسی طرح کی لچک کے قائل نہیں تھے، سرسید احمد خاں مرحوم کے

بڑے قدرداں تھے اور بڑا احترام کرتے تھے، ایک مجلس میں راقم نے ان کا ذکر کیا اور عادت کے مطابق مرحوم یا علیہ الرحمہ نام کے ساتھ زبان سے نکلا، غزالی صاحب نے اچھی خاصی بحث کر ڈالی، عقائد کے باب میں سرسید کی بحثوں کے سبب وہ اپنے تمام تر توسع کے باوجود اس کو برداشت نہ کر سکے، حالانکہ عام حالات میں وہ اس طرح کی گفتگو سے گریز کرتے تھے، لیکن جہاں ہمجولیوں اور بے تکلف لوگوں کی مجلس ہوتی وہاں عام طور پر بہت سے پردے ہٹ جایا کرتے ہیں، غزالی صاحب کی تڑپ، غیرت دینی اور کتاب وسنت پر ان کی نظر اور محبت تب دیکھنے کو ملی جب اس ادارے میں علی گڑھ میں موجود تجدد وتشکیک کے علمبردار راشد شاذ کا موضوع چھڑا، دراصل طبقہ علماء کو سب سے پہلے اس کی طرف اپنے مخصوص انداز میں ایک تبصرے سے غیور عالمِ دین مولانا سید سلمان حسینی ندوی حفظہ اللہ نے متوجہ کیا، وہ تبصرہ جوانھوں نے شاذ کی ایک کتاب پر کیا تھا مجھے بھیجا اور مجھے جھنجھوڑا بھی، اسی زمانے میں شاذ نے ایک کانفرنس کا اعلان کیا تھا جس میں ایک محور اسلام میں اصلاح کے امکان سے متعلق بھی تھا، راقم نے اس وقت طویل اور تند وتیز اداریہ اپنی بساط بھر لکھا، پھر غزالی بھائی نے اس کو موضوع بنایا، اس کی کتابوں کو پڑھنا شروع کیا، اس کے خطرے سے امت کو آگاہ کرنے کا بیڑا اٹھایا، مسلسل کئی مضامین ان کے قلم سے فکر شاذ کے تعاقب میں ''ماہنامہ ندائے اعتدال'' میں نکلے، ان مضامین سے ہی جناب غزالی کی علمی امامت کا راز کھلا، ان کی علمی گہرائی کا پتہ چلا، غزالی بھائی کے علاوہ اس دوران رسالہ میں بعض دیگر تبصرے شائع ہوئے، کئی مضامین برادر گرامی احمد الیاس نعمانی صاحب کے نکلے، جلدی ہی خیال ہوا کہ بار بار ایک ماہنامہ میں اس کا تذکرہ از خود اس کے تعارف کا ذریعہ بن رہا ہے، اس کے سبب وہ سلسلہ روک دیا گیا، لیکن غزالی بھائی نے اسی دوران ایک اکیڈمی کے قیام کا فیصلہ کر لیا، جس کا اصل ہدف فتنۂ انکار حدیث کا تعاقب، تجدد وتشکیک کے پردے چاک کرنا اور فکری انحرافات اور فکری گمراہیوں سے امت کو متنبہ کرنا تھا، غزالی بھائی نے ''ندائے اعتدال'' میں اس وقت جو مضامین لکھے تھے وہ کچھ اس طرح تھے۔

-راشد شاذ اور واقعہ معراج	جلد۹/شمارہ۱-۲	جولائی/اگست ۲۰۱۶ء
-راشد شاذ اور غزوہ بنو قریظہ	جلد۸/شمارہ۳	ستمبر //
-مسجد اقصیٰ کے سلسلہ میں راشد شاذ اور یہودی مستشرقین کی فکری ہم آہنگی	جلد۸/شمارہ۵	نومبر //
-عمل صالح کے تعلق سے راشد شاذ کا خطرناک مغالطہ	ج۸/شمارہ۶	دسمبر //
-راشد شاذ اور عمل صالح	ج۸/شمارہ۷	جنوری ۲۰۱۷ء

غزالی صاحب کا خیال تھا کہ راشد شاذ کا اکثر سرمایہ مستشرقین کی تحریروں کا چربہ ہے، بسا اوقات انھوں نے ایسے مستشرقین جن کی اسلام دشمنی مشہور زمانہ ہے کے اقتباسات کا گویا ترجمہ کر لیا ہے، میری معلومات کی حد تک انھوں نے ایسی کتابیں جمع کرنی شروع کر دی تھیں، اور یہ کام بھی شروع کیا تھا کہ شاذ کی عبارتوں کو پیش کر کے دکھایا جائے کہ انھوں نے کس مستشرق کے کون سے اقتباس سے استفادہ کیا ہے، معلوم نہیں اس سلسلہ کا کام وہ کس حد تک کر پائے تھے، البتہ ان کی ایک ضخیم تصنیف تیار تھی جو ان کی زندگی میں اشاعت پذیر نہ ہو سکی، اس کتاب کا موضوع بھی وہی فکر ہے جس کی نمائندگی شاذ کرتے ہیں، یہ لوگ بدون شرط اس دور کے اہل کتاب کو مسلمان شمار کرنے کا نظریہ رکھتے ہیں بلکہ تمام تر قرآنی

صراحتوں کے باوجود اس پر بصد نظر آتے ہیں، غزالی صاحب نے نہ صرف اس نظریہ کا تحقیقی، استدلالی اور تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے بلکہ صحیح اسلامی نقطۂ نظر بھی پیش کیا ہے۔

اپنی نو قائم شدہ اکیڈمی کے ذریعہ آئندہ وہ ایک علمی مجلّہ نکالنے کا منصوبہ رکھتے تھے، سرِ دست انھوں نے ''الجمعہ'' کے نام سے ایک ہفت روزہ فولڈر کی اردو، ہندی اشاعت شروع کی تھی، جس کی کئی ہزار کاپیاں علی گڑھ کی مساجد میں تقسیم کرواتے تھے اور پی ڈی ایف کی شکل میں سوشل نیٹ ورک پر بھی اس کی خوب ترسیل ہوتی تھی، اس فولڈر کا اسلوب علمی مگر عام فہم ہوتا ہے، یہ غزالی صاحب کی گویا اصل زندگی کا آغاز تھا جو ادھر دو تین سالوں میں انھوں نے شروع کیا تھا، اس سے نہ صرف ان کی شخصیت سامنے آئی تھی بلکہ ان کے ذریعہ بہت سے مفید علمی اور سماجی واصلاحی کام شروع ہوئے تھے، جو اللہ کی ذات سے امید ہے کہ یوں ہی جاری رہیں گے، غزالی صاحب دراصل اس اکیڈمی کے ذریعہ ایک ایسا لٹریچر تیار کرنا چاہتے تھے جس کا اسلوب علمی مگر افادہ عام ہو، گویا وہ دارالمصنّفین کے علمی لٹریچر اور عوامی اسلوب کے درمیان ایک متوسط اسلوب میں لٹریچر کی تیاری چاہتے تھے، اس سلسلہ کی کئی دعوتی واصلاحی کتابیں انھوں نے اپنے رفقاء سے تیار کرا کر شائع بھی کیں، یہ بات دراصل میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ہم دونوں نے باہمی مشورے سے مدرسہ میں ایک شعبۂ تدریب وتحقیق قائم کیا تھا، جو بوجوہ ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد صرف کاغذ پر زندہ رہ گیا، غزالی صاحب نے جب اپنی اکیڈمی قائم کی تو اس وقت جو دعوتی وعلمی وفکری خاکہ زیر بحث آیا تھا اس کے متعدد پہلوؤں کو مذکورہ بالا اضافہ کے ساتھ پیش نظر رکھا اور اختیار کیا، اللہ تعالیٰ اس اکیڈمی کو ان کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔

غزالی بھائی بہت بڑے آدمی تھے اسی لیے بہت چھوٹے بن کے رہتے تھے، تواضع ایسی کہ جس سے ملتے وہ ان کا گرویدہ ہو جاتا، وہ ماشاء اللہ بڑی اچھی فیملی سے تعلق رکھتے تھے مگر سادگی ایسی، استغنا و بے نیازی ایسی کہ ان کے صاحب حیثیت ہونے کا شائبہ تک نہ ہوتا، وہ دوسروں کی دل آزاری سے حتی المقدور بچتے تھے، اگر ان کو شبہ بھی ہو جاتا تو فوراً معذرت طلب کرتے تھے، فی الحقیقت وہ ولی صفت انسان تھے، علمی گہرائی، فکری بلندی، زاہدانہ طرز اور عابدانہ ذوق کے ساتھ زندہ دلی اور ظرف کی وسعت وکشادگی جیسے اوصاف کم لوگوں میں جمع دیکھے جاتے ہیں، دراصل ہمارے یہاں کا مزاج یہ ہے کہ ایک خاص ہیئت اور خاص خلفیہ ونسبت کے بغیر کسی کو بزرگ اور مقربِ بارگاہِ الٰہی کی سند نہیں دی جاتی، اس خاص نقطۂ نظر سے ہٹ کر دیکھیں تو میرا دوست زندہ دل تھا، قرآن کے بیان کردہ کامیاب مومن کے اوصاف سے متصف تھا، اخلاق نبوی کی جھلک اس کے نشست وبرخاست میں نظر آتی تھی، بغض وحسد، عناد ومخالفت اور غیبت واستحصال اور جلب منفعت کے لیے تمام حدود کو پار کر جانے کی عام وباؤں سے میں نے اسے مبرأ دیکھا اور پایا، وہ خلوت کے قائل نہ تھے، میدان عمل میں نشاط انگیز زندگی گذارنا چاہتے تھے، امت کی تڑپ ان کے اندر موجزن تھی، اس کے لیے وہ مختلف محاذوں پر کوشاں تھے، شوقِ شہادت سے سرشار رہتے تھے، امت کی زبوں حالی، علماء امت کے مصلحت پسندانہ رویے اور بالخصوص عالمی حالات پر جب بھی ان سے تبادلۂ خیال ہوتا تو ان کی فکرمندی دیکھنے کے لائق ہوتی، گذشتہ ۸/ سالوں میں جو حالات پیش آئے، ان میں جب بھی میں نے کچھ لکھا انھوں نے دعائیں دیں اور بھرپور تائید کی، کثرت سے دعائیں دینا بھی ان کا خاص وصف تھا، وہ

دراصل ان حالات میں وہی موقف رکھتے تھے جو ہم جیسے لوگوں کا تھا، یہ الگ بات کہ وہ بہت زیادہ صراحت کے قائل نہ تھے اور وسائل اظہار کا استعمال نہ کرتے تھے، مختلف الخیال لوگوں کو برتنے کا انھیں ہنر معلوم تھا، انھیں لاکھ کسی سے عقیدت واحترام کا تعلق ہو مگر وہ بے اصولی کی کسی بات میں کبھی معاون نہیں بنتے تھے، ان پر لاکھ دباؤ ہو مگر وہ جس چیز کو شرعاً درست سمجھتے تھے اس میں کسی کی بات نہیں تسلیم کرتے، وہ جس کے کام کو شرعاً درست سمجھتے، مفید وضروری سمجھتے کبھی کسی مصلحت کے پیش نظر اس کے آڑے نہیں آتے، وہ بڑوں کا بے پناہ احترام کرتے، چھوٹوں پر بے حد شفقت کرتے، مگر فکری لحاظ سے اس قدر پختہ تھے کہ جلدی کسی کی بات کو قبول نہ کرتے، بہت غور وفکر کے بعد کسی بات کی تائید کرتے، وہ تعلق سب سے رکھتے، بات سب کی سنتے لیکن کرتے وہی تھے جس کو براہ راست قرآن و سنت اور سیرت کی روشنی میں وقت و حالات کے لیے مفید و ضروری سمجھتے تھے، وطن عزیز کے تناظر میں غیر مسلموں میں دعوت اور ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنے سے متعلق جب بھی گفتگو ہوتی تو وہ بہت متفکر ہو جاتے اور بڑے عزم کا اظہار کرتے، میں نے اس سلسلہ کی جب اپنی سی کوشش (اسلام میں مذہبی رواداری) ایک کتابی شکل میں پیش کی تو انھوں نے بہت سراہا، پھر جب اس کا ہندی اور کچھ حصہ کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا تو بے پناہ خوشی کا اظہار کیا، برادرم فرید نے بتایا کہ آخری ایام میں غیر مسلموں میں دعوت کے کام کی فکر ان پر ایسی سوار تھی کہ ایک روز کہنے لگے کہ میں اس کام کو علی الاعلان پورے زور و شور سے کروں گا خواہ اس راہ میں میری جان چلی جائے۔

غزالی صاحب سے میرا تعلق دوستانہ اور مخلصانہ تھا، انتظامی معاملات کے علاوہ نہ کبھی کوئی لین دین کا تعلق رہا نہ کبھی ایک دوسرے کے مفاد وابستہ رہے، سچ یہ ہے کہ ان کی معاملہ فہمی، ان کی کشادہ دلی، ان کا وسیع ظرف، ان کی بے اعتنائی، ان کا استغنا میرے لیے قابل تقلید ہے، ان سے کبھی مجھے کوئی شکایت نہ ہوئی، بلکہ سچ پوچھیے تو انھوں نے کبھی شکایت کا موقع نہ دیا، بشریت سے کوئی خالی نہیں، انسانوں کے درمیان غلط فہمیوں کا پیدا ہو جانا فطری بات ہے، مگر غزالی صاحب ایسے مواقع پیدا نہیں ہونے دیتے، کئی بار ایسا ہوا کہ اگر دوسروں کے سبب ایسے مواقع پیدا ہو جاتے تو وہ کسی غلط فہمی کو باقی نہ رہنے دیتے، وہ فکر ونظر کے اختلاف کے باوجود کبھی مخالفت کے رویّے کو پسند نہ کرتے تھے، بلکہ اس طرح کے رویّوں کو بداخلاقی اور دیانتداری کے خلاف سمجھتے تھے، ان کے ظرف کی کشادگی اور فطری نیکی کا عالم یہ تھا کہ وہ اپنے اس بے مایہ مکتب کے ساتھی سے اس طرح معاملہ کرتے جیسے کوئی چھوٹا کسی بڑے سے، بسا اوقات مجھے شرمندگی محسوس ہوتی، میں اس پر تکلف تعامل پر ان سے شکوہ کرتا، بالآخر اجتماعی بے تکلفی میں وہ بھی ڈھل گئے تھے، وہ پہلے سا تکلف تو باقی نہ رہا تھا مگر جب بھی بات کرتے تو احترام سے کرتے، کوئی معاملہ درپیش ہوتا تو پورا لحاظ کرتے، اپنے دائرہ عمل اور اختیارات میں ایسا رویہ اپناتے کہ کبھی اختلاف وشکایت کا موقع نہ آتا، یہ معاملہ ان کا تقریباً سب کے ساتھ تھا، ان کا حال یہ تھا کہ وہ محبت میں کمی نہ آئے، اس کی خاطر برائیوں پر نظر نہ کرتے تھے، کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کے سامنے کوئی میری برائی یا تنقیص کرتا، جائز تنقید کی بات الگ ہے، وہ دراصل ''میرے تیرے'' حلقوں، گروپ بازیوں اور نسبتوں سے بہت بالا انسان تھے، ان کا حقیقی معنیٰ میں اللہ سے تعلق بہت مضبوط تھا اس لیے وہ ہر ایک سے تعلق رکھتے تھے، ہر نفع بخش انسان کی تائید کرتے اور ہر مضر

کام اور ضرر رساں انسان سے پرہیز کرتے۔

غزالی صاحب چلے گئے اور اس شان سے گئے کہ نہ کسی کو ان سے کوئی شکوہ ہے نہ شکایت بلکہ ہر ایک کو ان کی کمی کا بھر پور احساس ہے، بالخصوص راقم سطور قدم قدم پر ان کی ضرورت محسوس کرتا ہے، سچ ہے کہ کسی چیز کی قدر اس کے کھونے کے بعد معلوم ہوتی ہے، آج بھی یقین نہیں آتا کہ وہ رخصت ہو گئے، روز صبح لگتا ہے کہ ابھی بس آتے ہوں گے، اپنے نرالے انداز میں محبت بھرے سلام کا تبادلہ کریں گے اور ہنستے مسکراتے خیریت دریافت کریں گے، ان کے ملاقات کرنے کا انداز اتنا والہانہ پرتپاک اور اپنائیت سے بھرپور ہوتا تھا کہ افسردہ طبیعت میں بھی بشاشت پیدا ہو جاتی، احمد فراز نے تو خیالی بات کی تھی مگر غزالی بھائی واقعی بات کرتے تھے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے، ان کی گل افشانی، شیریں کلامی بڑی جاذب و پرکشش تھی، کئی بار ایسا ہوتا کہ میں کسی الجھن میں مبتلا ہوتا، چہرے پر پریشاں فکری کے آثار ہوتے، اور غزالی بھائی ملتے ہی تاڑ لیتے، گفتگو اپنے مخصوص انداز میں شروع کرتے اور پھر سب اگلوا لیتے، اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ مخلصانہ مشورے دیتے اور الجھن وغم بانٹ لیتے، ان کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ وہ دوسروں کی ترقی اور خوشی سے بہت خوش ہوتے تھے اور برکت کی خوب دعائیں دیتے تھے، ورنہ اس دور میں لوگ اگر حسد میں مبتلا نہ بھی ہوں تو کم از کم تجسس میں ضرور لگ جاتے ہیں، یہ راز تو انتقال کے بعد کھلا کہ وہ دوسروں کی خوشی اور ترقی سے اس قدر خوش ہوتے تھے کہ اپنی خوشی میں اپنے گھر والوں کو بھی شریک کرتے، ان کی والدہ محترمہ نے میری اہلیہ کو بتایا کہ جب طارق صاحب نے ایسا .....کیا تو میرے بابو (غزالی صاحب) نے گھر آتے ہی بڑی خوشی سے ہم لوگوں کو بتایا۔

اس ادارے میں غزالی بھائی کو ان کی علمی و اخلاقی بلندی کے سبب مرجعیت حاصل تھی، سب اساتذہ ان سے رجوع کرتے تھے، اپنے مسائل میں ان سے مشورہ کرتے تھے، وہ خود بھی سب کی فکر کرتے تھے، سب سے اپنائیت کا اظہار کرتے تھے، میں خود بھی ان سے علمی استفادہ کرتا تھا، راز کی بات ہے مگر کہے دیتا ہوں، بہت سے لوگوں کے لیے باعث حیرت ہوگی، بالخصوص ان لوگوں کے لیے جو غزالی صاحب کو بڑا مصلحت پسند اور دنیا و مافیہا سے بے خبر سمجھتے تھے، اکثر و بیشتر میں اپنی تحریریں ان کو ناقدانہ نظر ڈالنے کے لیے دیتا تھا، بہت کم ایسا ہوتا کہ چھپنے سے قبل ان کو نہ دوں، خاص طور پر جب حساس مسائل اور گرم موضوعات پر لکھتا تو ان کو بیٹھا کر سناتا، جب وہ تعریف کے پُل باندھتے تو میں نقد کی خواہش کرتا اور کہتا کہ آپ کی تعریف معتبر نہیں کیونکہ آپ بہت مبالغہ کر دیتے ہیں، لوگ ان کو جو کچھ سمجھتے ہوں مگر میں نے ہر بار یہی دیکھا کہ کوئی بات اگر مزاج شریعت اور منہج سیرت کے منافی نہیں تو لوگوں کی نظر میں خواہ وہ کسی قدر خلافِ مصلحت ہو مگر غزالی صاحب اس کے بھرپور مؤید ہوتے، البتہ آخری درجہ کی صراحت سے گریز کرتے، وہ چلے گئے، اب ان کی یادیں ہیں، باتیں ہیں، حسرتیں اور تمنائیں ہیں، اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے، ان کے درجات بلند فرمائے، ان کی سیئات کو حسنات سے مبدل فرمائے، اس ادارے کے کسی فرد کا ان کو بدل بنا دے، ان کا اور ہم سب کا انجام صدیقین شہداء اور صالحین کے ساتھ فرمائے۔

☆☆☆

کوئی محفل ہو، تیرا رنگِ محفل یاد آتا ہے

آہ مولانا غزالی مرحوم!

محمد فرید حبیب ندوی

صدمہ کیا ہوتا ہے، یہ پہلی بار میں نے اُس دن جانا۔ خبر ایسی اندوہ ناک اور حادثہ ایسا جانکاہ تھا کہ پورا وجود دہل کر رہ گیا۔ زندگی کی کتنی ساعتیں گزریں؛ مگر آہ، وہ ساعت کیسی ہوش ربا تھی! مدت زیست کے کتنے لمحے بیتے؛ لیکن آہ، وہ لمحہ کیسا قیامت خیز تھا۔ مولانا کے انتقال کی خبر ملی، تو سچ مچ لگا جیسے زندگی کے سامنے سے قیامت گزر گئی ہو۔ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے'' سے بھی آگے ''یہ نہیں ہوسکتا ہے'' کی کیفیت طاری تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان جس سے محبت کرنے لگتا ہے، تو اس کی محبت میں اس کے فنا ہونے کا استحضار بھی کھو بیٹھتا ہے۔ دنیا کی جس چیز سے وہ جی لگا لیتا ہے، پھر یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اب یہ چیز کبھی اس سے دور نہ جائے گی۔ حضرت عمرؓ کی وصال رسول ﷺ کے موقع پر جو کیفیت تھی، وہ دراصل اسی طرز محبت کی عکاس ہے۔ وہ خاتم النبیین ﷺ سے جس درجے کی محبت کرنے لگے تھے، تو یہ سمجھنے لگے تھے کہ فراقِ محبوب کا غم انھیں کبھی نہ سہنا پڑے گا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ رسول پاک ﷺ کو ان سے چھین لیا جائے۔ اور اگر یہ سچ ہے تو پھر انھیں چین کیسے آئے گا؟ ان کی آنکھوں کو قرار کیوں کر ملے گا؟ کس کے سہارے پھر وہ سفر حیات کی منزلیں طے کریں گے؟ دل میں محبت کا میٹھا سا درد پھر کس کے لیے اٹھے گا؟ دل میں تڑپ پھر کس کے تصور سے پیدا ہوگی؟ لیکن دنیا کی سب سے بڑی سچائی یہ ہے کہ یہ انسان کی سب سے بڑی غلط فہمی ہے۔ یہ حادثے اور صدمے خدا کی طرف سے شاید اسی لیے دیے جاتے ہیں کہ انسان اس خام خیالی سے باہر نکلے اور دنیا کی حقیقت سے آشنا ہو۔

یہ دنیا کھیل ہے اور کھیل بھی ہے چند لمحوں کا
نظر جو کچھ بھی آتا ہے، اسے خوابِ گراں سمجھو

اسی دھوکے میں ہم بھی گرفتار تھے۔ مرحوم سے جو محبت تھی، اسے کیوں کر الفاظ کا قالب دیا جا سکتا ہے!! محبت تو ایک احساس ہے، ایک جذبہ ہے۔ اور یہ کھوکھلے الفاظ کب جذبات کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ یہ کب احساسات کی سچی ترجمانی کر سکتے ہیں؟ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اِن الفاظ نے احساسات وجذبات کی حق تلفی کی ہے۔ اِنھوں نے احساسات وجذبات کی گہرائی اور پاکیزگی کو نقصان پہنچایا ہے۔ مگر دوسری طرف یہ بھی سچائی ہے کہ انسان مجبور و بے بس ہے۔ جذبات کی ترجمانی کے لیے اس کے پاس الفاظ کے سوا سہارا ہی کیا ہے۔ ہاں کبھی وہ یہ کام دل سے لیتا ہے۔ جب دل سے دل تک جذبات منتقل کیے جاتے ہیں، مگر دل کی سنتا کون ہے اور دل کی گہرائی تک پہنچتا کون ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ مولانا کے مرثیے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔آج سے تقریباً ایک صدی قبل ایسے ہی ایک جوان ؛ بلکہ (۲۸ سالہ) نوجوان عالم کی موت پر اردو کے مایہ ناز ادیب مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ نے صفحۂ قرطاس پر قلم سے جو آنسو بہائے تھے، میں وہی مولانا مرحوم کی نذر کرتا ہوں۔مولانا نے لکھا تھا:

''پہاڑوں اور پہاڑی غاروں میں پتھر کے ٹکڑوں اور سنگ ریزوں کی تعداد شمار سے خارج پڑی ہوئی ہے۔جنھیں انسان اور جانور ہر وقت پامال کرتے رہتے ہیں؛لیکن ان ہی میں کوئی سنگ ریزہ لعل و یاقوت بن کر نکل آتا ہے،جس کی قیمت پوری ایک سلطنت کی آمدنی کے برابر ہوتی ہے۔اس کو اگر کوئی توڑ ڈالے تو دل پر کیا گزر جائے گی؟ سمندر میں بارش کے قطرے ہر سال گرتے رہتے ہیں، جو کسی حساب میں نہیں آتے ؛ لیکن انھی میں چند قطرے وہ بھی ہوتے ہیں جو آغوش صدف میں پل کر موتی بن کر نکلتے ہیں اور تاجِ سلطانی کا زیور بنتے ہیں۔ان کو اگر کوئی سمندر میں پھینک دے تو دل کو کیوں کر صبر آئے گا؟ جنگل میں خودرو بیل اور پتے، درخت اور پودے، بوٹیاں اور پتیاں ؛ہزاروں قسم کی ہوتی ہیں، جو جانوروں کی غذا کا کام دیتی ہیں؛لیکن گلاب کی تازہ شاداب کلی، بزمِ ہستی کو معطر کرنے کے لیے ہوتی ہے۔یہ کلی اگر پھول بننے کے ساتھ ہی خزاں کی دست برد کی نذر ہو جائے تو دل کو کیا کہہ کر سمجھایا اور قابو میں رکھا جاسکتا ہے؟.....ایک چراغ جلا؛ لیکن قبل اس کے کہ اُس کا اُجالا پوری طرح پھیلے، بجھ گیا۔ایک آفتاب چمکا؛لیکن پیشتر اس کے کہ اس کی شعاعیں پورا نور پھیلائیں،غروب ہوگیا۔ایک پھول کھلا،مگر معاً مرجھا گیا۔سبزہ لہلہایا،مگر فوراً خشک ہوکر زمین کے برابر ہوگیا۔حق کی پکار بلند ہوئی؛لیکن معاً فضائے لامتناہی میں گم ہوگئی''۔

(وفیات ماجدی ص۶۶-۶۷)

یوں تو گردش ایام سارے غم بھلا دیتی ہے۔رات و دن کا الٹ پھیر اور رفتار زندگی کی ہنگامہ خیزی بڑے سے بڑے صدمے پر گرد ڈال دیتی ہے ؛مگر نہ معلوم کہ اس حادثے کو بھلانے میں کتنا وقت لگے گا! اور یہ زخم کب تک ہرا رہے گا؟ ایک مہینہ ہونے کو آیا،مگر ابھی تو صبر آ نہ سکا ہے:

لما دعوت الصبر بعدك و البكا
أجاب البكا طوعاً ولم يجب الصبر
فإن ينقطع منك الرجاء فإنه
سيبقى عليك الحزن مابقى الدهر

(تیرے چلے جانے کے بعد صبر کی ہزار کوششوں کے باوجود،صبر نہ آسکا۔آنکھ ہے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لیتی۔تو تو چلا گیا؛لیکن تیرے جانے کا غم ہمیشہ ستائے گا)۔

بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مرحوم کے چلے جانے کا ابھی تک یقین ہی نہیں ہوتا۔ان کی تصویر نگاہوں کے سامنے گردش کرتی رہتی ہے۔کسی نکڑ،کسی موڑ اور کسی بھی گلی کوچے سے گزرتے ہوئے ان کا چہرہ پردۂ تصور پر ابھر آتا ہے۔ان کا زندہ ہونا پردۂ ذہن پر ابھی تک نقش ہے، جب کہ ان کی موت کے لیے تصور جمانا پڑتا ہے۔جب بھی ان کے محلے سے گذرنا ہوتا تھا،تو ایسا کبھی نہ ہوتا کہ راستے میں ان سے ملنے کا خیال نہ آتا ہو۔بلکہ ہمیشہ اندر سے آواز آتی تھی کہ ہوسکتا ہے مولانا سے ملاقات ہو جائے ؛مگر آہ!اب دل پر کیا گزرتی ہے جب ان کی گلیوں سے گزرنا ہوتا ہے!!

مولانا سے میری رفاقت کی سرگزشت سات سالہ مدت پر محیط ہے۔آخری تین سالوں میں یہ رفاقت،قربت

میں بدلی، پھر قربت (عمر کے اچھے خاصے فرق کے باوجود) دوستی میں، اور پھر دوستی عقیدت ومحبت میں، پھر اس محبت میں کب وارفتگی آتی چلی گئی، احساس ہی نہیں ہوا۔ پھر تو کیفیت یہ ہوگئی تھی کہ اگر چند دن ملاقات نہ ہوتی، یا فون پر بھی رابطے کی شکل نہ بنتی، تو ایک عجیب بے چینی سی ہونے لگتی۔ جب کبھی وہ دو تین دن اکیڈمی تشریف نہ لا پاتے تو میں عرض کرتا: ''مولانا آپ آیا ضرور کریں، چاہے کچھ ہی دیر کے لیے آئیں۔ آپ کے بغیر دل نہیں لگتا''۔ اگر وہ کبھی مدرسے نہ آتے، تو شاید ہی ایسا ہوتا کہ میں ان کے صاحبزادے عمر غزالی سے یا براہ راست مولانا سے فون پر استفسار نہ کر لیتا۔ ادھر کئی سال سے اتفاق یہ رہا کہ ایک دو درجوں میں ان کے گھنٹے کے فوراً بعد میرا گھنٹہ ہوتا۔ میں پہنچتا تو مولانا کا درس چل رہا ہوتا۔ مجھے دیکھ کر یا تو فوراً باہر تشریف لے آتے یا کبھی بڑی انکساری سے دو تین منٹ مانگتے۔ اس موقع پر بھی گفتگو اور ملاقات کا بہانہ مل جاتا۔ اور اس ایک دو منٹ کی ملاقات سے ہی دل کو عجیب سی خوشی محسوس ہوتی۔

میرے قلمی سفر کی ابتدا یوں تو دار عرفات، رائے بریلی کے زمانے سے ہوئی، جب میں وہاں شعبۂ افتا سے وابستہ تھا۔ سب سے پہلا مضمون ''بانگ حراء'' میں شائع ہوا تھا، جو دراصل عالیہ رابعہ میں ہفتہ واری بزم کے لیے لکھا گیا ایک مختصر سا مقالہ تھا۔ استاد محترم مولانا فیصل بھٹکلی ندوی مدظلہ نے تحسین و آفرین سے نوازتے ہوئے فرمایا: یہ تو اشاعت کے قابل ہے۔ پھر مولانا نے خود ہی ''وہ بانگ حراء'' کے دفتر بھیجا اور جون ۲۰۱۰ء میں وہ شائع ہوا۔ لیکن باقاعدہ طور پر -ویسے تو ابھی بھی بے قاعدہ ہی ہے- لکھنے کا آغاز علی گڑھ آکر ہوا۔ میرا پہلا ہی سال تھا کہ ماہنامہ ندائے اعتدال، علی گڑھ کے مدیر محترم ڈاکٹر طارق ایوبی صاحب زید مجدہ نے ''ادب اسلامی نمبر'' نکالنے کا ارادہ کیا۔ اس مناسبت سے انھوں نے اپنے PhD کے مقالے کے چار طویل مضامین کے ترجمے کی ذمہ داری مجھے سونپی۔ پتہ نہیں ترجمہ واقعی اچھا تھا یا موصوف نے محض دل جوئی کی خاطر خوب تحسین وتعریف کی۔ شاید مولانا غزالی مرحوم کو اسی سے خیال ہوا کہ اس پر محنت کرنی چاہیے۔ اس کے بعد مولانا نے گویا میری رہنمائی کا ذمہ لے لیا۔ سب سے پہلے قطر الندی کے مسائل کو سوال وجواب کے انداز میں کروایا، جو قطر الندی کوئز کی شکل میں شائع ہوئی اور جس کا دوسرا ایڈیشن ابھی مولانا کی وفات سے دو مہینے قبل چھپ کر آیا ہے۔ اور پھر اس کے بعد تو میری جتنی بھی تحریریں شائع ہوئیں، ان سب میں مولانا کی رہنمائی ضرور شامل رہی۔ اور پھر جب اکیڈمی قائم ہوئی تو مولانا نے مجھ سے کئی کام کروائے جن میں بعض کتابی شکل میں شائع بھی ہوئے اور کچھ ہنوز زیر طبع ہیں۔

میرے ترجمے سے مطمئن ہوکر طارق ایوبی صاحب نے مجھے رسالے کی ادارت میں (بحیثیت معاون مدیر) شامل کر لیا تھا۔ اس بہانے کچھ نہ کچھ لکھنا ہوتا رہتا۔ پھر تین سال قبل ''پیام سیرت'' کے کالم سے میں نے ایک سلسلہ شروع کیا، جس میں سیرت کے کسی واقعے کو ایک نئے رنگ واسلوب میں پیش کیا جاتا۔ قارئین نے اس سلسلے کو خوب پسند کیا اور بہت سوں نے راقم کی حوصلہ افزائی کی۔ مولانا مرحوم بھی جب مضمون پڑھتے تو مبالغہ آمیز حد تک تحسین فرماتے۔ اور ادھر اپنا بھی یہ حال تھا کہ جب تک مضمون مولانا کی نظر سے گزر نہ جاتا، دل کو اطمینان نہ ہوتا۔ مولانا کسی بھی حال میں ہوتے اور کیسے ہی مشغول ہوتے، مضمون پر نظر ڈالنے سے کبھی بھی بے زاری

کا اظہار نہ کرتے ؛ بلکہ ہمیشہ اس طرح پیش آتے جیسے وہ منتظر رہتے ہوں۔

مولانا کی ذات میں بعض خوبیاں ایسی تھیں کہ چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتیں۔اورانھی اوصاف وکمالات نے انھیں ہر دل عزیز ومحبوب بنایا تھا۔اور آج ہر ایک کی زبان پر ان کے ترانے ہیں۔اور ہر شخص ان سے اپنی محبت وفدائیت کا اظہار کر رہا ہے:

کوئی حد ہی نہیں شاید محبت کے فسانے کی
سنا تا جا رہا ہے، جس کو جتنا یاد ہوتا ہے

ان کی ایک خاص صفت یہ تھی کہ وہ کسی سے اپنے درد وغم یا پریشانی کا اظہار تو کبھی نہ کرتے -اِلا ماشاء اللہ-؛لیکن دوسروں کا دکھ درد ہمیشہ بڑے غور سے سنتے۔اور نہ صرف سنتے ؛ بلکہ اسے دور کرنے کے لیے ممکنہ تگ ودو سے بھی دریغ نہ کرتے۔بلکہ فرماتے تھے کہ ''آج ہر ایک اپنی سنانا چاہتا ہے۔دوسروں کی بات سننے کے لیے کوئی تیار نہیں۔جب کہ سنانے سے زیادہ سننا ضروری ہے۔اگر ہم کسی کی پریشانی دور نہیں کر سکتے تو کم از کم اس کا دکھڑا سن کر اس کا غم ہلکا تو کر سکتے ہیں''۔وہ اس سلسلے میں دوسروں کا اس حد تک خیال کرتے کہ آدھا آدھا، ایک ایک گھنٹہ کھڑے رہتے اور لوگ اپنی سناتے رہتے۔آخری مہینوں میں وہ کہنے لگے تھے کہ کبھی کبھی اکیڈمی کے لیے نکلتا ہوں تو کوئی نہ کوئی گھیر لیتا ہے، اور اچھا خاصا وقت چلا جاتا ہے۔چنانچہ اِدھر کچھ عرصے سے وہ عشاء کی نماز اپنے محلے کی مسجد میں پڑھنے سے گریز کرنے لگے تھے۔اس لیے کہ نماز کے بعد کوئی نہ کوئی انھیں پکڑ لیتا اور وہ انکار نہ کر پاتے، اور اس طرح اکیڈمی پہنچنے میں تاخیر ہو جاتی۔

دوسروں کو آگے بڑھانا اور خود کو پیچھے رکھنا، ان کی ایسی خوبی تھی جو اب کمیاب ہی نہیں، نایاب ہے۔اب خورد نواز لوگ ہی نہیں رہے، تو خورد پرور کہاں سے ملیں! ان سے کسی پروگرام میں تقریر کرنے کی فرمائش کی جاتی تو بڑی مشکل سے تیار ہوتے۔اکثر اپنے احباب میں سے ہی کسی سے کہتے کہ آپ کر لیے۔آپ بہت اچھی تقریر کرتے ہیں۔ حالانکہ جب وہ تقریر کرتے تو محفل پر چھا جاتے۔اگر چہ عموماً وہ خطیبانہ آہنگ میں تقریر نہیں کرتے تھے ؛ بلکہ اکثر وبیشتر واعظانہ اور تذکیری انداز اختیار کرتے۔ان کی آواز میں ایسی چاشنی وسحر آفرینی تھی کہ سامعین محظوظ ومسحور ہو جاتے۔ عام لوگوں میں ان کی تقریر بہت مقبول تھی۔اگر چہ ابھی وہ بحیثیت خطیب بہت زیادہ معروف نہیں تھے ؛لیکن شہر علی گڑھ میں جہاں بھی ایک مرتبہ ان کا بیان ہوا، وہاں کے لوگ ان کے دیوانے ہو گیے۔خود میرے حلقۂ احباب میں بعض ایسے افراد ہیں جو مولانا کی جادو بیانی کے نہ صرف قائل ؛ بلکہ مولانا کے دیوانے تھے۔ان کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ تقریر برائے تقریر کے آدمی نہ تھے ؛ بلکہ دل کی گہرائی سے گفتگو کرتے تھے۔وہ کبھی بھی اپنی علمی دھاک بٹھانے کے چکر میں نہ رہتے ؛ بلکہ قرآنی آیات واحادیث پر مشتمل بڑی سادہ اور عام فہم تقریر کرتے۔انگریزی بہت اچھی جانتے تھے۔میں ان سے کبھی کہتا بھی تھا کہ مولانا علی گڑھ کے ماحول میں دورانِ تقریر انگریزی الفاظ استعمال کیا کیجیے۔یہ مفید ومؤثر ہوگا۔وہ ہنس کر ٹال دیتے اور نہ کے برابر ہی ان کی انگریزی دانی کا اظہار ہو پاتا۔

دراصل وہ بڑے مخلص انسان تھے۔اس لیے اس طرح کے ہتھکنڈوں سے دور ہی رہتے۔اس دورِ جاہ پسندی

ونام طلبی میں ان کے جیسا مخلص انسان عنقا ہے۔ میں نے اپنی مختصر سی زندگی میں ان کی طرح کا مخلص و بے لوث شخص نہیں دیکھا۔ کہتے ہیں کہ شہرت وجاہ طلبی کی بیماری راہ سلوک میں سب سے آخر آخر میں دور ہوتی ہے۔ مگر وہ اس بیماری سے اول روز سے ہی پاک تھے۔ شہرت وناموری کو انھوں نے کبھی مقصود نہ بنایا؛ بلکہ اسے کبھی خاطر میں ہی نہ لائے۔ ورنہ اگر وہ چاہتے تو ان کے پاس ایسے اسباب ووسائل تھے، جن کے ذریعے وہ آسانی شہرت وناموری حاصل کر سکتے تھے۔ مگر وہ ہر کام خدا تعالی کی رضا جوئی کی خاطر کرتے تھے۔ اور ہم لوگوں کو بھی نصیحت کرتے تھے کہ کام صرف اللہ کے لیے کرنا چاہیے۔ فرماتے تھے کہ دنیا میں بڑے بڑے لوگ آئے اور چلے گیے۔ اگر کوئی بڑا بن بھی گیا اور شہرت کے بام عروج پر پہنچ بھی گیا تو بھی آخر ایک دن موت ہے۔ اس لیے اسے مقصود بنانا حماقت و بے وقوفی کے سوا کچھ نہیں۔

یہ ان کا اخلاص ہی تھا کہ کبھی وہ دوسروں پر غالب آنے یا دوسروں سے جیتنے کی کوشش نہ کرتے۔ جیسی ان کی علمی حیثیت تھی، عام طور پر ایسے لوگوں میں کچھ نہ کچھ ''انا'' تو آ ہی جاتی ہے۔ اور اگر ''انا'' نہ بھی آئے، تب بھی یہ ان کے لیے بڑا مشکل ہوتا ہے کہ وہ کسی علمی نکتے کے حل کے لیے اپنے خوردوں یا شاگردوں سے رجوع کریں۔ لیکن مولانا اپنی علمی جلالت شان کے باوجود خوردوں سے سوال کرنے میں ذرا بھی نہ ہچکچاتے۔ جب ان کے ذمے مختارات کی تدریس آئی تو چونکہ میں پہلے پڑھا چکا تھا، اس لیے وہ اکثر و بیشتر مجھ سے تبادلۂ خیال کرتے، اور اس انداز سے کرتے جیسے کوئی چھوٹا اپنے بڑے سے پوچھتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے شرم سی محسوس ہونے لگتی؛ مگر انھیں ذرا بھی تکلف نہ ہوتا۔ یہ ان کی ایسی خوبی تھی جو ہر طالب علم کو اپنانی چاہیے۔

میرا احساس ہے کہ مولانا اپنے لیے کم، دوسروں کے لیے زیادہ جیتے تھے۔ اور یہ صفت آخری سالوں میں خاص کر میں نے محسوس کی۔ وہ ہمیشہ ہم رفقاے کار کو بنانے کی فکر کرتے۔ وہ واقعی میں معلم ومربی تھے۔ اور ایک مربی کے سارے اوصاف ان کی ذات میں جمع تھے۔ مولانا کا اندازِ تربیت بھی بڑا نرالا تھا۔ اس میں نبی پاک علیہ السلام کے اندازِ تربیت کی جھلک صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ اخلاص وفکر مندی کے ساتھ شفقت ومحبت کی ایسی آمیزش تھی، جو ان کے (رفقا) (ماتحتوں) اور شاگردوں کو ان کا گرویدہ بنائے رکھتی۔ انھیں دوسروں سے کام لینے کا ہنر بڑی اچھی طرح آتا تھا۔ وہ کبھی آمرانہ رویہ اختیار نہ کرتے۔ کسی کام کا حکم دینا بھی چاہتے، تو بھی اس میں آمرانہ انداز کی بجائے گزارش وفرمائش کا رنگ ہوتا۔ جب کبھی ہم رفقاے اکیڈمی کی طرف سے کام میں سستی ہوتی تو وہ بڑے پیار ومحبت بھرے انداز میں توجہ دلاتے۔ ان کا انداز ایسا ہوتا کہ کبھی ہمارے ماتھے پر شکن تک نہ آتی؛ بلکہ اندر ہی اندر ہمیں احساس شرمندگی ہونے لگتا۔ یہی حال ان کا طلبہ کے ساتھ بھی تھا۔ ان کی ڈانٹ میں بھی محبت کا رس ہوتا۔ وہ کبھی بھی کسی طالب علم کو شکست خوردگی یا کمزور وکم تر ہونے کا احساس نہ دلاتے۔ ان کا انداز حوصلہ شکن کبھی نہ ہوتا، چاہے طالب علم کیسی ہی غلطی کر جائے؛ بلکہ وہ کمزور سے کمزور طالب علم کو بھی اس طرح حوصلہ دلاتے اور ایسی ہمت افزائی کرتے کہ اس میں بھی شوق کی چنگاری جاگ جاتی اور اس کی، اندر کی مایوسی دور ہو کر ایک نئی امنگ اس میں پیدا ہو جاتی۔ یہ ان کی ایسی معلمانہ خوبی تھی جو ہر معلم واستاد کو

اپنانے کی ضرورت ہے۔

مولانا رجال ساز شخصیت تھے۔ان کی نگاہ بڑی جوہر شناس تھی۔ وہ دوسروں کی صلاحیت کو نہ صرف پہچان لیتے؛ بلکہ اس کی بڑی قدر کرتے ۔ ہمیشہ دوسروں کو ان کی صلاحیتوں کی طرف توجہ دلا کر انھیں مہمیز کرتے ، شوق دلاتے ،حوصلہ افزائی کرتے ،اور چھوٹے سے چھوٹے کام پر دل کھول کر تعریف کرتے ۔ اور سچی بات یہ ہے کہ ان کی زبان سے تعریف سننا اچھا لگتا تھا؛ بلکہ انھیں مضمون چیک کرانے کا مقصد اصلاح کے ساتھ ایک یہ بھی ہوتا کہ ان کے کلماتِ تحسین وآفرین شوق دل کو اور مہمیز کر جائیں گے ۔ اپنی مثالیں تو بہت سی ہیں، انھیں ذکر کرنا شاید مناسب نہ ہو۔صرف اپنے ایک رفیق کا ایک واقعہ ذکر کیے دیتا ہوں، جس سے مولانا کی اس خوبی کا کچھ اندازہ ہوگا۔ ہمارے مدرسے کے سابق ٹائپسٹ برادرم عبدالرحمٰن ندوی نے ایک دن چند سطریں نیوزی لینڈ کی پرائم منسٹر کے نام (واقعہ کرائسٹ چرچ کے بعد)اس کی تعریف میں بس ایسے ہی لکھ دیں۔مولانا کی جب نظر پڑی تو برادرم کی بڑی تعریف کی ۔ کہا کہ تم تو بہت اچھا لکھ لیتے ہو۔ لکھتے رہا کرو۔ اور اس میں اضافہ کر کے کسی اخبار میں بھیجو۔اسی کا نتیجہ تھا کہ عبدالرحمٰن بھائی نے اس میں اضافہ کر کے ماہنامہ انقلاب کو بھیجا۔اوران کا یہ مختصر سا مضمون مراسلے کی شکل میں شائع ہوا۔(بعد میں عبدالرحمٰن بھائی مزاحاً کہا کرتے تھے کہ اب ہم کمپوزنگ کا کام نہیں کریں گے،اب تو ہم بھی مضمون نگار ہو گئے ہیں)۔

مولانا کا مطالعہ بڑا وسیع وعمیق تھا۔اور خاص بات یہ کہ انھیں مطالعے کا استحضار خوب رہتا۔کبھی کبھی میں ان سے تعجب سے کہتا کہ مولانا آپ ہر موضوع پر بغیر کسی پیشگی تیاری کے بڑی اچھی بحث کر لیتے ہیں۔آخر آپ نے کتنا مطالعہ کر رکھا ہے۔وہ عاجزی سے میری بات ادھر ادھر گھما دیتے؛لیکن کمال کی بات یہ تھی کہ کوئی سا بھی موضوع چھڑ جاتا، وہ جب گفتگو کرتے تو ایسا لگتا جیسے انھوں نے اس کا تازہ تازہ مطالعہ کیا ہو۔ حالانکہ اب انھیں مطالعہ کا موقع کم ہی مل پاتا تھا۔ دراصل جن سالوں میں وہ ملک سے باہر رہے تو انھوں نے اپنا وقت ضائع نہیں کیا؛ بلکہ اس وقت کو انھوں نے مطالعے میں صرف کیا۔ان کا وہی پرانا مطالعہ تھا جواب کام آتا تھا۔

ان سب خوبیوں کے ساتھ،ان کی سب سے بڑی خوبی ان کا کردار تھا۔ان کی بلندیٔ اخلاق اور عظمتِ کردار کا گواہ ان کا ہر ایک ملنے والا ہے۔اس صفت میں ان کی نظیر نہیں تھی۔یوں بڑے بڑے اہل علم وعمل اور اہل ریاضت ومجاہدہ موجود ہوں گے؛لیکن ان کی طرح کا بااخلاق وباکردار شخص شاید ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے۔وہ چھوٹوں سے بھی ایسی عاجزی وانکسار کے ساتھ ملتے تھے کہ چھوٹے ،اپنے بڑوں کے ساتھ بھی ایسا عاجزانہ انداز نہ اختیار کرتے ہوں گے۔کیا دوست کیا اجنبی،کیا رشتے دار کیا پڑوسی،کیا شاگرد، کیا استاد؛ ان سے جو بھی ملتا،ان کے کردار سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا۔

اُن کی اِسی خوبی نے اُن کی شخصیت کو پرکشش ومقناطیسی بنا دیا تھا۔ہر ایک اُن کی طرف کھنچتا چلا جاتا۔اور وہ کسی کو بھی دور نہ کرتے۔ ہر ایک کو قریب کرتے اور ہر ایک کو محبت کا جام پلاتے۔

مولانا دوسروں کو دعائیں دینے میں بڑے سخی واقع ہوئے تھے ۔ ایک ہی وقت میں ڈھیر ساری دعائیں دے ڈالتے تھے۔ وہ صرف جزاک اللہ خیراً کہنے پر اکتفانہ

کرتے تھے؛ بلکہ ایک ساتھ کئی کئی جملے کہتے۔ دعاؤں میں بھی خاص کر جنت کی دعا بہت دیتے تھے۔ اور یہ معاملہ صرف رفقاء و احباب کے ساتھ ہی نہ تھا؛ بلکہ اپنے گھر والوں؛ حتی کہ اپنی اہلیہ کے ساتھ بھی ان کا یہی رویہ تھا۔ اپنی اہلیہ محترمہ سے عموماً- جب انھیں چائے کی طلب ہوتی -مزاحاً فرماتے: ''جنت چاہیے''۔ وہ کہتیں: ''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، چائے بنا کر لاتی ہوں''۔ دعاؤں کے ساتھ وہ دوسروں کی خیریت بڑے اہتمام سے پوچھتے تھے۔ حتی کہ وہ اس میں غلو کی حد تک مبتلا تھے۔ بتانے والوں نے بتایا کہ وہ جتنی بار بھی باہر سے گھر میں تشریف لاتے، ہر بار والدین اور بیوی بچوں کی خیریت ضرور پوچھتے۔

مولانا مجلسی آدمی تھے۔ وہ بڑے ظریف ومزاح پسند تھے۔ جس مجلس میں ہوتے، جانِ محفل ہوتے۔ ان کی موجودگی مجلس کو زعفران زار بنا دیتی۔ وہ تقوی وللّٰہیت میں بلند معیار پر ہوتے ہوئے بھی اپنے دوست واحباب سے دل کھول کر مذاق کرتے۔ وہ زاہد خشک نہ تھے؛ بلکہ ایک زندہ دل آدمی تھے، اور ان کی زندہ دلی دوسروں کو بھی زندگی بخشنے کا کام کرتی تھی۔ مزاح و دل لگی کے ساتھ وہ مجلس میں علمی موضوعات بھی چھیڑتے رہتے اور پھر آپس میں مباحثہ اور تکرار کا دور شروع ہوتا، اور اس طرح سب کو ان کے علمی کمال سے مستفید ہونے کا موقع مل جاتا۔ آج جب مدرسے یا اکیڈمی میں کوئی مجلس سجتی ہے تو ان کے بغیر سونی سونی لگتی ہے، ان کے دیدار کو آنکھیں اور آواز سننے کو کان ترستے ہیں:

زمزموں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ آواز اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے

مولانا گھر کے ملازمین کا بڑا خیال کرتے۔ ان کے گھر والوں نے بتایا کہ جب بھی گھر میں کھانے پینے کی کوئی چیز آتی، خواہ کتنی ہی کم مقدار میں ہو، جب تک گھر کی خادماؤں کو نہ دلوا دیتے، چین نہ لیتے۔ بسا اوقات گھر والے کہتے بھی کہ چیز تھوڑی ہے، پھر آئے گی تو انھیں بھی دے دیں گے؛ لیکن مولانا بااصرار دلواتے؛ بلکہ جب بھی گھر میں کوئی چیز آنے والی ہوتی، تو گھر کے ممبروں کے ساتھ ملازموں اور خادماؤں کو بھی شمار کرتے اور سب کے حساب سے منگاتے۔

مولانا اس سلسلے میں نمونہ تھے کہ ایک عالم کو محلے میں کس طرح رہنا چاہیے۔ عموماً بہت سے علماء و فارغینِ مدارس اپنے محلوں میں عوام سے کٹ کر رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں ان کے بارے میں منفی تاثر پایا جاتا ہے۔ مولانا اس سلسلے میں مثال تھے۔ وہ ہر ایک سے گھل مل کر رہتے۔ لوگوں کی ضرورتیں پوری کرتے۔ ضرورت کا سامان بھی خرید کر لا دیتے۔ راستے میں کوئی مل جاتا تو اس کی پوری خیر خیریت پوچھتے۔ اگر کوئی ضعف ہوتا تو اسے اپنی گاڑی پر گھر تک چھوڑ کر آتے، اپنے انھی اوصاف کی وجہ سے وہ پورے محلے کے محبوب اور منظورِ نظر بن گئے تھے۔ ان سے بچے بھی محبت کرتے تھے، جوان بھی اور بوڑھے بھی۔

غرض کن کن خوبیوں اور کن کن اوصاف وکمالات پر بات کی جائے۔ وہ جامع الکمالات شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے اخلاقی جوہر تو لوگوں پر کھل گئے تھے؛ لیکن ابھی ان کی علمی وفکری عظمت سے پردے پوری طرح نہیں ہٹے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ خود کو اتنا دبا کر اور پس پردہ رکھنے کی کوشش کی کہ ان کی شخصیت دب کر رہ گئی۔ اب وقت آیا تھا کہ ان کی علمی بلندی، فکری عظمت اور ملی تڑپ سے دنیا آشنا ہوتی۔ مگر ان کی شخصیت کا پھول پوری طرح کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گیا:

یہ پھول اپنی لطافت کی داد پا نہ سکا
کھلا ضرور، مگر کھل کے مسکرا نہ سکا

اگر انھیں چند سال کی مہلت اور مل جاتی تو دنیا حیرت سے کہتی:

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی

ابھی عمر ہی کتنی تھی۔ ابھی تو انھوں نے اس گلستاں نما زخزاں آباد کی محض ۳۸ بہاریں ہی دیکھی تھیں۔ مگر کاتب تقدیر نے ان کے لیے اتنا ہی وقت لکھا تھا:

قضا آتی ہے جب، دیتی نہیں ایک بھی پل جینے کو

آہ مولانا! .....آپ ہمیں داغِ مفارقت دے گیے۔ اب صرف آپ کی یادیں ہیں۔ آپ کے خواب ہیں، جنھیں شرمندۂ تعبیر کرنے کا عزم اور خدائے پاک سے توفیق کی دعا ہے۔ آپ دور ہو کے بھی دل کے قریب ہیں۔ نگاہوں سے اوجھل ہو کے بھی، نظروں کے سامنے ہیں۔ آپ کی یادیں، آپ کی باتیں، آپ کی دعائیں، آپ کی محبتیں، آپ کی شفقتیں، آپ کی ادائیں؛ ہمارے ساتھ ہیں۔

افسوس کہ آپ کی زندگی میں ہم آپ کی قدر نہ کر سکے۔ آپ کی فکر مندی اور دل سوزی کی گہرائی تک نہ پہنچ سکے۔ آپ کی بے لوثی و مخلصانہ جذبے کو سمجھ نہ سکے۔ آپ چلے گئے، مگر آپ کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات اب دل کو زخمی کیے دے رہے ہیں۔ آپ کی یادیں اب کچوکے لگا رہی ہیں۔ آپ کی باتیں یاد آتی ہیں تو دل ڈوبنے لگتا ہے۔ آپ کی تصویر نظر کے سامنے گھومتی ہے تو آنکھ ٹپکنے لگتی ہے۔، آہ کس طرح آپ سمجھاتے تھے۔ آپ کی نصیحتوں میں کیسا اخلاص، کیسا درد اور کیسی تڑپ تھی۔ کس طرح آپ نے ایک کندۂ ناتراش کو تراشنے کا عزم کیا تھا، مگر افسوس کہ وہ آپ کے جذبات کو سمجھ نہ سکا۔ کس طرح آپ لکھنے پڑھنے پر ابھارتے تھے۔ کس طرح آپ اخلاص کا درس دیتے تھے۔ کس طرح آپ ملی و دینی خدمت کے لیے شوق کو مہمیز کرتے تھے۔ کس طرح آپ ملک کے مسلمانوں کے تئیں فکر مندی بیدار کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ آہ! جب کوئی الجھن آتی تھی، تو کس پیار و محبت سے آپ اسے حل کرتے تھے۔ آپ کی سی شفقت و محبت، دردمندی اور تڑپ اب کہاں ملے گی؟

آپ کی ایک ذات میں میرے لیے کتنے پہلو تھے! مجھے آپ سے بڑے بھائی کا پیار، استاد کی نصح و خیر خواہی، والد کی سی شفقت و فکر مندی، دوست کی سی بے تکلفی اور مرشد و رہنما کی نبض شناسی و تشخیص ملتی تھی۔ آپ تھے تو لگتا تھا کہ ہم بھی کسی کام کے بن سکتے ہیں۔ کچھ بننے اور کچھ کرنے کا جذبہ صحیح معنی میں آپ نے ہی پیدا کیا تھا۔ زندگی کو ایک رخ پر ڈالنے کی کتنی بار آپ نے نصیحت کی تھی، مگر افسوس اس لاابالی پن پر کہ آپ کی باتوں پر عمل نہ ہو سکا۔ اب لگتا ہے جیسے زندگی یتیم ہو گئی ہے۔ اب نہ وہ تحریک و ترغیب ملے گی، نہ وہ تفہیم و تلقین۔ نہ وہ نصح و خیر خواہی اور نہ وہ ارشاد و تشخیص۔

آ کہ تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

خدائے رحیم و کریم آپ پر رحم کرے۔ آپ کی مغفرت کرے۔ آپ کی تربت کو جنت نشاں اور آپ کو انبیاء وصدقین و شہداء کا ہم دم و ہم نشیں بنائے۔ اور ہمیں آپ کے منصوبوں کی تکمیل اور آپ کے خاکوں میں رنگ بھرنے کی ہمت و توفیق عطا فرمائے۔ وماذلك على الله بعزيز۔

☆☆☆

❑ نقوش و تأثرات

آہ مولانا محمد غزالی ندویؒ!

(ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے)

محمد خالد ضیا صدیقی ندوی

(رفیق علمی: امام بخاری ریسرچ اکیڈمی، علی گڑھ)

یہ اٹھ گیا کون انجمن سے کہ سب کو احساس ہے کمی کا
دیے کی لو تھرتھرا رہی ہے، قدم لرزتا ہے روشنی کا

جمعہ کا دن تھا، تاریخ ۱۰/شوال ۱۴۴۰ھ مطابق ۱۴/ جون ۲۰۱۹ء کی اور وقت کوئی دس بجے کا۔ میں نے برادر عزیز مولانا محمد اسلم قاسمی کو ایک ضرورت سے فون کیا۔ فون اٹھاتے ہی انھوں نے کہا: ''مولانا بہت بیمار ہیں اور میڈیکل کے ایمرجنسی وارڈ میں داخل ہیں''۔ ان کی بات پر مجھے بالکل یقین نہیں ہو رہا تھا کہ میں رات دیر تک مولانا کے ساتھ ''الجمعہ میگزین'' کی تیاری میں مصروف رہا تھا؛ لیکن جب گھر سے تصدیق ہوگئی، تو بعجلت تمام ہم دونوں میڈیکل پہنچے۔ وہاں جو منظر دیکھا، وہ میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ ڈاکٹروں کی ٹیم ان کو ہوش میں لانے کی پوری کوشش کر رہی تھی؛ پر افسوس کہ کاتب تقدیر کا فیصلہ کچھ اور ہی ہو چکا تھا، اس طرح تقدیر کے آگے تدبیر نہ چل سکی اور آدھے گھنٹے کی پوری کوشش کے بعد ڈاکٹروں نے ان کی موت کی تصدیق کر دی۔ وہ وقت میرے لیے کتنا اندوہ ناک اور الم ناک تھا، اسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا:

غم کی آگ بڑی البیلی، کیسے کوئی بجھائے
اندر ہڈی ہڈی سلگے، باہر نظر نہ آئے

فوراً رفیق محترم مولانا محمد فرید حبیب ندوی کو فون کیا، وہ مولانا محمد عارف ندوی صاحب اور مولانا عالم ندوی صاحب کے ہمراہ بہت تیزی سے میڈیکل پہنچے۔ کچھ دیر میں مخدومی ڈاکٹر یمین اشرف صدیقی ندوی صاحب اور برادر مخلص مولانا مفتی عامر مظاہری صاحب بھی تشریف لے آئے، پھر ہم سب دیر تک پھوٹ پھوٹ کر روتے اور مولانا کی یاد میں آنسو بہاتے رہے۔ مفتی صاحب کو یارائے ضبط نہیں تھا۔ ان کے ضبط کا بندھن بار بار ٹوٹ جاتا تھا؛ کیوں کہ:

سر پہ آجاتی ہے جب کوئی مصیبت ناگہاں
اشکِ پیہم دیدۂ انساں سے ہوتے ہیں رواں
ربط ہو جاتا ہے دل کو نالہ وفریاد سے
خونِ دل بہتا ہے آنکھوں کی سرشک آباد سے

یہ صورت حال تقریباً بیشتر لوگوں کی تھی۔ مولانا مرحوم کے محلے والوں کی بڑی تعداد وہاں پہنچ چکی تھی۔ سب کی آنکھیں اشک بار، سب کے لبوں پر آہیں، سب بدحواس و پریشان اور مغموم ومنتشر:

سب کے چہروں پر اداسی، سب کی آنکھیں اشک بار
سب کے دل محزون وغمگیں، سب کے سب زار ونزار

'بے قرارم! اشک بارم! سخت زارم اے عزیز!'

کہنے والے نے کتنی سچی بات کہی ہے کہ ''بہت

سے غم بیان نہیں ہوسکتے۔دل کی بہت سی چوٹیں الفاظ نہیں بن سکتیں۔بہت سے صدمے کہے نہیں جا سکتے۔غم کی اصل نزاکت تو لفظوں میں آ کر مجروح ہوجاتی ہے''۔لیکن کیا کیا جائے ،آنکھ کے آنسو، جس طرح واردات قلب کی تھوڑی بہت ترجمانی کردیا کرتے ہیں،قلم کی سیاہی بھی لہو بن کر کبھی کبھی حال دل بیان کردیا کرتی ہے۔اب میں کیسے اور کس سے بتاؤں کہ میرا وہ مربی جس کی حکیمانہ انداز تربیت سے میں بے حد متاثر تھا،حیف! کہ راہی ملک عدم ہوا۔وہ علمی سرپرست جس کے پاس بیٹھ کر بارہا اپنی جہالت ولاعلمی کا اعتراف کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پایا،حسرتا! کہ وہ ہمیشہ کے لیے پیوند خاک ہوگیا۔علمی کہکشاں کا وہ مہرتاباں جس کی ضوفشانی سے ایک عالم کو روشنی مل رہی تھی،دریغا! کہ وہ روپوش ہوگیا۔وہ رفیق مہرباں جسے دیکھ کر آنکھیں روشن ہوجایا کرتی تھیں،افسوس! کہ وہ داغ مفارقت دے گیا۔حسن خلق کا وہ درنایاب جس کی شفافیت اور روشنی آنکھوں کو نور اور دل کو سرور پہنچایا کرتی تھی،وامصیبتا! کہ وہ غرق دریا ہوگیا۔وہ دل جوخلوص وایماں کی تابشوں سے دمک رہا تھا،صدافسوس! کہ وہ ڈوب گیا:

بے نالہ منہ سے جھڑتے ہیں بے گریہ آنکھ سے
اجزائے دل کا حال نہ پوچھ اضطراب میں

غزالی بھائی! آہ! کیسے بتائیں کہ آپ کو کھو کر ہم نے کیا کیا کھودیا ہے۔ہوسکتا ہے کہ پڑھنے والے اسے غلو یا مبالغہ پر محمول کریں؛ پر جو آپ کو جانتے تھے، پہچانتے تھے، آپ کے صحبت یافتہ اور مجلس باش تھے،وہ اعتراف کریں گے کہ ہم نے آپ کو کھو کر صرف اس جسمانی قالب کو نہیں کھویا ہے جس سے آپ کی زندگی عبارت تھی؛ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہم نے اس قلب کو کھویا ہے جو امت کے لیے دھڑکتا اور تڑپتا تھا۔اس سینے کو کھویا ہے جو بے کینہ اور علم وفضل کا گنجینہ تھا۔اس دماغ کو کھویا ہے جو قرآن وحدیث کے احکام ومعارف،اسلامی علوم اور عصری فنون کا منبع وسرچشمہ تھا۔اس معصوم چہرے کو کھویا ہے جسے دیکھ کر اول وہلے میں دل یہ شہادت دیتا تھا کہ اس چہرے والے میں دوسروں کو ایذا پہچانے اور دل دکھانے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ان آنکھوں کو کھویا ہے جو شرم وحیا کے نور سے روشن تھیں۔اس زبان کو کھویا ہے جو"فلیقل خیراً أو لیصمت" پر عمل پیرا تھی۔ان ہاتھوں کو کھویا ہے جو لوگوں کو دکھ دینے کے بجائے سکھ پہنچانے کے کام آتے تھے۔ان پاؤں کو کھویا ہے جو غریبوں محتاجوں، بیواؤں اور یتیموں کے لیے دوڑ دھوپ کیا کرتے تھے۔

سب کہاں، کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہوگئیں

غزالی بھائی! آپ کی شفاف زندگی،علم آموز مجلس اور صالح صحبت نے بامقصد انسان بننے کا جذبہ پیدا کیا۔اب آپ تو چلے گئے اور وقت ہی پر گئے،اور ہر انسان کو اپنے وقت معین پر جانا ہی جانا ہے،پر:

شکر کرم کے ساتھ یہ شکوہ بھی ہو قبول
اپنا سا کیوں نہ مجھ کو بنا کر چلے گئے

غزالی بھائی! میری خوشی کی انتہا نہ رہی،جب کاتب تقدیر نے آپ کے ساتھ رہنے اور آپ کی نگرانی میں کام کرنے کا فیصلہ سنایا۔علی گڑھ کیا آیا کہ مجھ پر آپ کے جوہر کھلنے شروع ہوئے۔ہر ایک کی زبان پر آپ کی صلاح وتقوے اور نیکوکاری کے چرچے تھے۔گلی گلی میں آپ کے حسن اخلاق کا شہرہ تھا۔غزالی! فیاض غزالی! شریف وعفیف غزالی! علم وفضل سے لبریز غزالی! تواضع وانکساری کا پتلا غزالی! صلاح وتقوی سے آراستہ غزالی! تحریر وتقریر میں یگانہ غزالی! ذہانت

وذکاوت میں ممتاز غزالی! سب کا محبوب غزالی! ہر دل عزیز غزالی!..... یہ سب اپنے کانوں سے چلتے پھرتے اس وقت سن وقت سنتا تھا جب میں یہاں نو وارد تھا۔لیکن غزالی بھائی !جب میں نے آپ کو قریب سے دیکھا، جانچا ، پرکھا، ناپا، تولا، تو بخدا جتنا سنا تھا، اس سے سوا ہی پایا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ کی زندگی بے داغ اور معصوم تھی؛ پر جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا، اس کی روشنی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کی عظمت کو محسوس کر کے بڑے بوڑھے، دوست احباب، اپنے پرائے، حتی کہ آپ کے اساتذہ بھی آپ کی عزت کے لیے بے تاب ہوجایا کرتے تھے ۔آپ کی خوش اخلاقی وملنساری، حیاو پاک دامنی، تواضع وخاکساری، دردمندی وغم گساری، امانت داری وراست بازی، احتیاط وتقوی اور سیرت وکردار کی پختگی کے سبھی قائل تھے۔ مجھے کوئی شخص ایسا نہ ملا جس نے آپ کی ذات وشخصیت پر تہمت لگائی ہو۔اتنی کم عمری میں اتنے متنوع اوصاف وکمالات کی حامل شخصیت مجھے اپنی زندگی میں صرف اور صرف آپ ہی نظر آئے۔**وذلک فضل اللّٰہ، یؤتیہ من یشاء.**

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

غزالی بھائی !آپ کی زندگی بھی قابل رشک تھی اور موت بھی قابل رشک ہوئی ۔آپ کی زندگی ہی میں، مجھ سے ایک موقع پر محلے کے ایک ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا: ''میں نے اپنی زندگی میں مولانا غزالی جیسا مومن نہیں دیکھا''۔ایک صاحب ثروت شخص نے تو آپ کے روبرو کہا تھا:''بخدا آپ سے مجھے بے حد محبت ہے''۔آپ نے بھی جواب میں یہی کہا تھا:''واللہ! مجھے بھی اللہ کی خاطر آپ سے بڑی محبت ہے''۔ جب آپ رخصت ہوگئے: تو محلے کے ایک شخص نے بھراتی ہوئی آواز میں کہا:''ہم لوگوں کو سب کچھ مل سکتا ہے ؛لیکن اب غزالی کہاں سے لائیں گے ؟۔ جب تعزیت اور جنازے میں شرکت کے لیے بڑی تعداد میں لوگ جمع ہورہے تھے، تو محلے کی سرکردہ شخصیت جناب ڈاکٹر حصین الدین صاحب یہ کہہ کر مہمانوں کا استقبال کررہے تھے کہ ''غزالی ہمارے بیٹے کی طرح تھے، محلے کا ہر گھر غزالی کا گھر ہے''۔حیات میں بھی اور وفات کے بعد بھی اہل تعلق کے، قدردانی کے یہ جملے کس بات کی شہادت دیتے ہیں!اسی بات کی نا، کہ اس نمونے کے جواں بڑی مدت میں پیدا ہوا کرتے ہیں۔

میں اپنے آپ کو بہت سعید اور خوش نصیب سمجھتا تھا کہ اللہ نے مجھے آپ کی صحبت صالح اور خوان علمی کی ریزہ چینی کے لیے یہاں بھیج دیا، اور تین سال کی قلیل مدت میں، میں نے بقدر ظرف وذوق کسب فیض کی کوشش بھی کی؛لیکن:

حیف درچشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم وبہار آخر شد

میں حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ دو شخصیتوں کے انتقال سے مجھے سخت صدمہ پہنچا۔ایک ہمارے مشفق، مربی ، کریم استاذ حضرت مولانا عبد اللہ محمد حسنی ندوی صاحب کی وفات سے۔اور دوسرے میرے مخلص وہمدرد، کرم فرما رفیق مولانا محمد غزالی ندوی کی وفات سے۔ یہ دونوں صدمے میری ذاتی زندگی کے سب سے دل دوز صدمے ثابت ہوئے:

ترا درد اتنا بڑا حادثہ ہے
کہ ہر حادثہ بھول جانا پڑے ہے

یادماضی:

سنہ ۱۹۹۵ء ہوگا، جب مولانا مرحوم کو پہلی بار دیکھا اور سنا۔ان کی عمر ۱۵/ برس رہی ہوگی۔ادارہ دعوۃ الحق، مادھوپور

سلطان پور، سیتامڑھی، بہار میں سالانہ جلسہ تھا، اس وقت، میں حفظ کا طالب علم تھا، اور مولانا دارالعلوم ندوۃ العلما جیسی عالمی دانش گاہ میں مصروف گل چینی تھے۔ اس جلسے میں انھوں نے نعت پڑھی اور ندوے کا ترانہ بھی۔ ایک سماں بندھ گیا۔ ایک تو کمسنی کا زمانہ، اس پر مستزاد غضب کا ترنم اور ''ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات'' کے آثار ہویدا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پورا مجمع ان کو داد وتحسین سے نواز رہا تھا۔ خواتین بھی ترقی و اقبال مندی کی دعائیں دے رہی تھیں۔ اس وقت میری والدہ محترمہ کے منھ سے جو جملہ نکلا وہ یہ تھا: ''کاش میرا بیٹا بھی ایسا پڑھتا، ایسا ہوتا''!

اس کے بعد تقریباً بیس برس کا عرصہ گزر گیا۔ اس دوران، وہ دارالعلوم ندوۃ العلما سے فارغ ہوکر موریشس پھر دبئی میں قوم وملت کی خدمت میں مصروف ہوگئے۔ میں بھی ندوے سے فراغت حاصل کر کے جامعہ فیضان القرآن، احمد آباد (گجرات) میں تدریسی خدمت انجام دینے لگا، اس عرصے میں گاہے گاہے صرف ان کا نام سنتا رہا؛ لیکن نہ ان سے کبھی کوئی ملاقات کی سبیل پیدا ہوئی، نہ بات چیت کی کوئی شکل نکلی۔

سنہ ۲۰۱۴ء کا اخیر تھا کہ استاذ محترم مولانا محمد قمر الزماں ندوی (استاذ مدرسہ نورالاسلام، کنڈہ، پرتاپ گڑھ) اپنے رفیق مکرم مولانا مفتی محمد رحمت اللہ ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلما، لکھنؤ) کے ساتھ فقہ اکیڈمی کے سالانہ پروگرام) منعقدہ جامعہ علوم القرآن، جمبوسر (میں شرکت کے بعد احمد آباد تشریف لائے، اور ماہنامہ ندائے اعتدال (علی گڑھ) کے دو شمارے عنایت فرمائے۔ رسالے کے مشمولات پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوا کہ رسالہ بڑا وقیع اور منفرد طرز کا ہے۔ مجھے بڑا پسند آیا۔ استاذ محترم کے حکم سے رسالے کے چیف ایڈیٹر محترمی جناب ڈاکٹر طارق ایوبی ندوی صاحب کو خط لکھ کر رسالہ جاری کرنے کی میں نے خواہش کی، ان کی کرم فرمائی سے رسالہ مجھ تک پہنچنے لگا۔ اب رسالے میں کبھی کبھی بحیثیت مضمون نگار محمد غزالی ندوی کا نام دیکھ کر میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ وہی غزالی بھائی تو نہیں ہیں جن کو بیس برس پہلے میں نے دیکھا اور سنا تھا۔ جلد ہی ان کے علمی اور تحقیقی مضامین دیکھ کر اندازہ ہوگیا کہ یہ وہی غزالی بھائی ہیں جو میرے لڑکپن کے دیدہ وشنیدہ اور میرے بھائی اور ہمشیرہ کے بچپن کے ساتھی ہیں۔

سنہ ۲۰۱۵ء کی بات ہے۔ ان کا ایک مضمون ندائے اعتدال میں شائع ہوا، عنوان تو ذہن میں نہیں رہا؛ پر اتنا یاد ہے کہ اس مضمون میں ڈاکٹر راشد شاز صاحب (ڈائریکٹر برج کورس، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) کے انحرافات وتلبیسات کا بڑی خوب صورتی کے ساتھ معروضی انداز میں تنقیدی جائزہ لیا گیا تھا۔ اس طرح کوئی بیس برس بعد ان کی تحریروں کے ذریعے ان سے ملاقات کا موقع ملا۔

اگر میرا حافظہ غلطی نہ کر رہا ہے، تو فروری ۲۰۱۵ء کا ذکر ہے کہ ایک روز سرِشام برادر محترم مولانا احمد ضیا ندوی کا فون آیا۔ احوال دریافت کرنے کے بعد انھوں نے یہ خوش خبری دی کہ دفاع دین اور تحفظ شریعت کا کام مؤثر انداز میں کرنے کی غرض سے غزالی بھائی ایک علمی اور تحقیقی ادارہ قائم کرنا چاہتے ہیں جس کے لیے انھیں ایک رفیق علمی کی ضرورت ہے۔ وہ تم سے اور تمھاری تحریر سے واقف ہیں، تمھیں اپنے یہاں رکھنا چاہتے ہیں، اگر تم مناسب سمجھو، تو غور کرو۔ میں نے کہا: مجھے غور وفکر کی مہلت دی جائے۔ پھر میں نے اپنے چند مشفق اساتذہ، مخلص احباب، والدین اور اپنے خویش و اقارب سے اس سلسلے میں مشورہ کیا، سبھوں نے اس پیش کش

کو قبول کرنے کی رائے دی۔ اس کے بعد مولانا مرحوم سے میری براہ راست گفتگو ہوئی، اور وقفے وقفے سے ہوتی رہی، وہ مفید کتابوں کے مطالعے کا مشورہ دیتے رہے، اور میں ان کی رہنمائی میں مطالعے کو وسعت دیتا رہا۔ جب جامعہ میں سالانہ تعطیل کا وقت قریب آیا، تو میں نے معاملات وشرائط کی وضاحت چاہی، انھوں نے میری ساری شرطیں قبول فرمائیں اور مجھے بھی کچھ چیزوں کا پابند بنایا۔ جب مجھے مکمل اطمینان ہوگیا تو احمد آباد سے سبکدوش ہو کر ۲۴/ جولائی ۲۰۱۶ء کو میں علی گڑھ آ گیا، اور ۲۵/ جولائی سے باضابطہ مولانا مرحوم کے گھر ہی میں ان کی نگرانی میں کام کرنے لگا۔ تقریباً ۲۰/ روز تک میں مولانا کے گھر رہا، اور وہ مجھے مہمان بنائے رہے۔ اس دوران مجھے مولانا کو قریب سے دیکھنے اور برتنے کا موقع ملا، پھر:

رفتہ رفتہ وہ میری ہستی کا ساماں ہوگئے
پہلے جاں، پھر جانِ جاں، پھر جانِ جاناں ہوگئے
پھر تو وہ نزدیک سے نزدیک تر آتے گئے
پہلے دل، پھر دل ربا، پھر دل کے مہماں ہوگئے

مجھے صرف تین سال تک مولانا مرحوم کی رفاقت اور ان کی سرپرستی میں رہنے کا شرف حاصل ہوا؛ لیکن میں پوری ذمے داری سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ میرے پچھلے بیس برس پر تین سال کا یہ عرصہ ہر لحاظ سے بھاری ہے:

آفاق را گردیدہ ام، مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام؛ اما تو چیز دیگری

مولانا ہمارے سر کی آنکھوں سے تو اوجھل ہو چکے ہیں؛ لیکن دل کے آئینہ خانے میں ان کی تصویر ہمہ وقت گھومتی رہتی ہے۔ جب بھی ان کی یاد آتی ہے، تو دل سے ایک آہ نکلتی ہے، اور نگاہوں کے سامنے ایک خوش مزاج اور پاکیزہ چہرہ گھوم جاتا ہے۔ لباسِ نشاط میں غم کو بہت ڈھانپنے کی کوشش کرتا ہوں، پر:

نہ اشک تھمتے ہیں چشمِ نم سے، نہ دل کو فرصت غم والم سے
الٰہی سب کچھ جہاں میں ہوتا؛ مگر فراقِ صنم نہ ہوتا

دل کھنچے بے ساختہ وہ تھی کشش حاصل تجھے:

کہا جاتا ہے کہ ''انسان کا صحیح رتبہ اس کے ہم نشینوں اور حلقۂ احباب سے پہچانا جاتا ہے''۔ یہ بات بالکل صحیح ہے؛ کیوں کہ گھر کے افراد اور دوست احباب کے درمیان انسان اپنی اضافی خوبیوں کو نمایاں کر کے اور خلقی ووصفی کمیوں کو چھپا کر بہت دنوں تک زندگی نہیں گزار سکتا۔ اس کی خوبیاں اور خامیاں ان پر منکشف ہوکر رہتی ہیں، اس لیے کوئی بھی انسان ''بہترین انسان'' کے معیار پر اسی وقت پورا اتر سکتا ہے، جب اس کے دوست احباب، عزیز واقارب، اس کی خوبیوں اور اس کی اخلاقی برتری کا اعتراف کریں۔ مولانا مرحوم کے عزیز واقارب، ان کے دوست احباب، ان کے محلے والوں، ان سے ملنے جلنے والوں اور ان کی نگرانی میں کام کرنے والوں کی مجموعی شہادتوں کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مولانا معصوم تو نہ تھے (کہ عصمت، انبیا کا خاصہ ہے)؛ پر وہ عظیم شخصیت، فرشتہ صفت اور بے شمار صلاحیتوں اور خوبیوں کے مالک تھے۔ پچھلے تین برس کی مسلسل رفاقت، جلوت وخلوت اور سفر وحضر میں مولانا مرحوم کو قریب سے دیکھنے کے بعد میں بلا تامل یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ان نیک اور ولی صفت نوجوان علما میں تھے جن کی تعداد ہر دور میں بہت کم رہی ہے۔ لگتا ہے کہ قسام ازل نے جب ان کے لیے صلاحیتوں اور خوبیوں کی تقسیم کا فیصلہ کیا، تو بڑی فیاضی سے کام لیا؛ کیوں کہ ان کی ذات میں جس قدر متنوع صلاحیتیں اور قابلیتیں جمع ہوگئی

تھیں، وہ خال خال لوگوں کا حصہ ہوا کرتی ہیں۔

اوصاف وکمالات:

مولا مرحوم ایک پہلودار اور جامع شخصیت کے مالک تھے۔ان کی ذات کئی حیثیتوں سے قابل فخر اور لائق صد رشک تھی۔ان میں ''ایک معلم کی دردمندی ودل سوزی، ایک مربی کی شفقت نوازی وکرم گستری، ایک خطیب کی جادو بیانی وسحر انگیزی اور ایک مصنف ومؤلف کی وسعت ظرفی وبلندفکری نظر آتی تھی''۔قرآن وحدیث پر ان کی بڑی گہری اور وسیع نظر تھی۔عربی نصوص کا انھیں غیر معمولی استحضار تھا،خاص کر حدیثیں انھیں بہت زیادہ یاد تھیں۔اللہ نے ذہانت وفطانت کے ساتھ درک وبصیرت سے بھی نوازا تھا۔ وہ مشکل مسئلے کی تہ تک بہت جلد پہنچ جاتے تھے اور عقدہ کشائی میں بڑا کمال رکھتے تھے۔زبان وادب کا بھی انھیں ستھرا ذوق تھا۔وہ ادبی شہ پاروں،خوب صورت جملوں، دلکش عبارتوں اور دل آویز ترکیبوں سے بڑا لطف لیتے۔عربی ،اردو کا کوئی اچھا شعر نظر سے گزرتا،تو دیر تک اسے گنگناتے اور اس سے محظوظ ہوتے۔اردو، عربی، انگریزی: تینوں زبانوں پر انھیں پوری قدرت حاصل تھی۔وہ ہندی بھی بقدر ضروت جانتے تھے،اس طرح وہ قدیم وجدید کے درمیان حلقۂ اتصال بن گئے تھے۔

اللہ نے ان کو تحریر وتقریر کی بھرپور صلاحیت سے نوازا تھا۔وہ لکھنے اور بولنے کے دوران اپنے موضوع سے ہٹتے نہیں تھے، یہ ان کی بہت بڑی خوبی تھی۔جیسا مجمع ہوتا، ویسی تقریر کرنے کی ان میں زبردست صلاحیت تھی۔ وہ رٹے رٹائے موضوعات پر خطاب کرنے کے عادی نہ تھے،ہر موضوع ان کے لیے آسان، اور آیات قرآنی اور احادیث نبویہ سے مزین ہوتا تھا۔ان کے لہجے میں شہد کی سی مٹھاس اور بیان میں پھولوں کی سی خوشبو تھی:

زمزموں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ آواز اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے؟

مولانا مرحوم ایک مقناطیسی اور دلنواز شخصیت کے مالک تھے جس کی قربت کا ہر شخص متمنی ہوتا ہے۔وہ لطف ومحبت کا پیکر اور اخلاق نبوی کا پرتو تھے، یہی وجہ ہے کہ ''وہ بے دینوں میں بھی ایسے ہی پیارے تھے جیسے دین داروں میں''۔خلق خدا سے محبت ان کا مشن، اور 'با دوستاں تلطف، با دشمناں مدارا' ان کا شعار تھا۔طبیعت میں نرمی، چہرے پر بشاشت ومسکراہٹ ان کی انفرادیت تھی۔

وہ جس خانوادے تعلق رکھتے تھے،اس میں اللہ نے شرافت ونجابت کے ساتھ علم ودولت کو جمع کر دیا ہے۔''خوش حالی کے باوجود خاکساری اور علم وفضل کے باوجود ملنساری'' ان کی عظمت کی گواہی دیتی تھی۔بڑے چھوٹے ہر ایک سے ملتے وقت وہ بچھ جاتے۔سلام کرنے میں پہل کرتے۔اور جب کسی سے مصافحہ کرتے،تو اس وقت تک اپنا ہاتھ نہ کھینچتے، جب تک وہ خود اپنا ہاتھ کھینچ نہ لیتا،جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ کی عادت شریفہ تھی۔

ان کے مزاج میں اعتدال تھا،جس کا ظہور ان کی تحریر وتقریر اور گفتار وکردار سے ہوتا تھا۔انھیں گروہ بندی (چاہے جس نوعیت کی بھی ہو،اس) سے سخت نفرت تھی۔ وہ بڑے اصول پسند آدمی تھے۔وہ اشخاص وافکار کو اصول کی روشنی ہی میں ناپتے اور جانچتے تھے۔نہ کسی کی محبت وعقیدت میں اس کی بے اصولی کو پسند کرتے تھے،اور نہ ہی کسی سے اختلاف کی صورت میں اس کی اچھائیوں پر پردہ ڈالتے تھے۔

تواضع وخاکساری ان کی سرشت میں داخل تھی؛ لیکن اس کے باوجود بے جا تواضع وتکلف،انھیں بالکل پسند

نہیں تھا۔ اگر ہم میں سے کوئی رفیق اپنی تحریر کو کمتر خیال کرتا، تو اسے تنبیہ فرماتے، کہتے: بھائی! اس سے اچھی تحریر اور کیا ہوسکتی ہے! پھر کہتے: بے جا تواضع ٹھیک نہیں ہے، یہ صلاحیتوں کو دفن کردیا کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ہمہ وقت تحسین کے کلمات ہی کہتے تھے؛ بلکہ غلطیوں پر تنبیہ، نامناسب تعبیرات اور اصلاح طلب جملوں کی نشاندہی کرکے مناسب تعبیر کی طرف رہنمائی فرماتے؛ لیکن انھیں اپنی رائے پر اصرار نہ ہوتا۔

اکثر ذمے داروں اور بڑوں کو یہ دیکھا گیا ہے کہ وہ چھوٹوں اور خردوں کی ہمت افزائی نہیں کرتے؛ بلکہ بڑی حد تک اس معاملے میں وہ بخیل واقع ہوتے ہیں، اس کے برعکس میں نے ہمیشہ دیکھا کہ مولانا اپنے رفقا کے معمولی کام کو بڑا بنا کر پیش کرتے اور کمزور سے کمزور ساتھیوں میں ہمت وحوصلہ کا ایسا اسٹیم بھر دیتے تھے کہ ان کی علمی گاڑی بہت دنوں تک سمت مستقیم پر چلتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی مولانا سے ہم یہ شکوہ بھی کرتے تھے کہ آپ کے مادحانہ اور قدردانہ کلمات سے بسا اوقات ہم لوگوں کو خوش گمانی اور غلط فہمی ہونے لگتی ہے۔ فرماتے: خالد بھائی! کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی بہت ضروری ہے۔ پھر فرمایا: مجھے کسی صاحب نظر عالم کا یہ جملہ آج تک یاد ہے کہ ''آج ہمارے اداروں میں مردم گری اور افراد سازی کا کام جوتھم سا گیا ہے، اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ بڑوں اور ذمے داروں میں اپنے چھوٹوں اور کارکنوں کی حوصلہ افزائی کا حوصلہ نہیں رہا''۔ مولانا کے اس خیال کی تائید وتصدیق ذیل کے اقتباس سے ہوتی ہے جسے مولانا نور عالم خلیل امینی مدظلہ نے اپنے طویل تجربے اور مدارس کی موجودہ فضا کو دیکھ کر تحریر کیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

قدیم اداروں میں کام کرنے کے بعد، ان کی بہت بڑی خرابی یہ نظر آئی کہ یہاں قدرناشناسی اور قدتراشی کے ساتھ حرف گیری اور شکوہ سنجی کا بڑا چلن ہے، جس کی وجہ سے کارکردگی کی صلاحیت متاثر ہوتی ہے اور حوصلہ ساتھ نہیں دیتا؛ بلکہ سارا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے..... کاش! ذمے داروں کو یہ بات معلوم ہوتی کہ ماتحت لوگوں کو حوصلہ افزائی کے دو بول سے کتنی خوشی ہوتی ہے، اور ان کے سامنے حوصلہ افزائی کا ایک جملہ کتنی دیرپا اور دوررس انرجی کا کیپسول ثابت ہوتا ہے''۔

مولانا مرحوم بڑے جوہرشناس تھے، وہ مخفی صلاحیتوں کو بہت جلد پہچان لیتے تھے، پھر ان کو ابھارنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ ان کا بہت بڑا امتیاز تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ صلاحیتیں ہر ایک کے اندر موجود ہوتی ہیں، بات صرف اتنی ہے کہ ان پر حوصلہ شکنی کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔

ہم لوگوں سے مولانا کے مراسم، پرخلوص اور برادرانہ تھے۔ حاکمانہ اور آمرانہ رویے سے وہ بہت گریز کرتے تھے۔ اپنے ماتحتوں سے جب کوئی کام لیتے، تو ایسا محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ حکم دے رہے ہوں؛ بلکہ نرمی اور محبت کے ساتھ ان سے گزارش کرتے تھے۔

ان کے اندر دینی حمیت وغیرت بہت زیادہ تھی۔ اگر کوئی اسلام اور شریعت پر اعتراض کرتا، تو خاموش نہ رہتے، کبھی جوش میں کھڑے ہوجاتے، کبھی اس کے جسم کو پکڑ لیتے، پھر اس کو دلیل اور پیار سے سمجھانے کی کوشش کرتے۔ اس کے کنفیوژن کو دور کرتے اور جب تک اس کو عقلی ونقلی دلائل سے مطمئن نہ کردیتے، انھیں چین نہ آتا۔

ان کے اندر آخری درجے کی احتیاط اور تقوی تھا۔ وہ حلال روزی کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ اس بات کی پوری کوشش کرتے تھے کہ حرام اور مشکوک مال کا ایک لقمہ بھی ان کے پیٹ میں جانے نہ پائے۔ وہ جب اکیڈمی آتے، تو منٹ منٹ کا حساب رکھتے، ایک منٹ زائد کی تنخواہ لینا بھی وہ جائز

نہیں سمجھتے تھے۔ دنیا اور حطام دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی فکر ان کے اندر بہت زیادہ تھی، گویا ان کی تمنا قلیل اور ان کے مقاصد جلیل تھے۔ وہ ان دعاؤں کا بڑا اہتمام کرتے جو قرآن وحدیث سے ثابت ہیں، خاص کر استغفار بہت کیا کرتے تھے۔

دروغ گوئی، غیبت، چغل خوری انھیں چھوکر بھی نہیں گزری تھی۔ نہ خود غیبت کرتے تھے، اور نہ کسی کو کرنے دیتے تھے۔ وہ کسی کے آبگینۂ دل کو ٹھیس پہچانے سے بہت بچتے تھے۔ ان کے اندر مروت اس درجے تھی کہ اپنے حق سے اس لیے دست بردار ہوجایا کرتے تھے کہ کہیں اس سے سامنے والے کو تکلیف نہ ہوجائے، گویا:

تمام عمر اسی احتیاط میں گزری
کہ آشیاں کسی شاخ چمن پہ بار نہ ہو

عفوودرگذران کی بہت بڑی خوبی تھی جواب کمیاب ہوتی جارہی ہے۔ اس خوبی کا اثر ان کی سیرت وکردار میں واضح طور پر نظر آتا تھا۔ چنانچہ ان کے دوست احباب اس بات کی شہادت دیں گے کہ ان کی طبیعت غیر منتقمانہ تھی۔ وہ اپنے مخالفین ومعاندین (جن کی تعداد ہر دور میں پائی جاتی رہی ہے) کی ناشائستہ حرکتوں، نازیبا کلمات، درشت رویوں اور ظالمانہ برتاؤ پر عفوودرگزر کی شبنم چھڑک کر اپنے آئینۂ دل کو ہمیشہ کے لیے دھو ڈالتے۔ غش وغل، کینہ وحسد جیسے اخلاقی امراض، ان کی ڈکشنری سے غائب تھے۔

وہ اخلاص کا پتلا تھے۔ جب بھی کوئی کام کرتے، تو اللہ کے لیے کرتے، دکھاوا، اپنی تعریف یا اپنے فائدے کے لیے کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ اس دور مادیت میں بھی شہرت اور عہدہ ومنصب کی طلب سے وہ بہت دور رہتے تھے، دوسروں کو آگے بڑھا اور خود کو پیچھے رکھ کر کام کرنے کے عادی تھے۔ وہ ملت کے مفاد کو اپنی ذات پر مقدم رکھتے تھے، اسی لیے ملت کے بکھراؤ اور انتشار سے وہ بڑے ملول اور افسردہ ہوتے تھے۔ وہ سب کو جوڑ کر رکھنے والے تھے۔ وہ نہ اپنے خاندان والوں کو بکھرنے دیتے تھے، نہ محلے والوں کو، نہ اپنے دوست احباب کو اور نہ امت کو۔ وہ بڑوں کی بہت زیادہ عزت کرتے تھے۔ ان کے مقام ومرتبے کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ چھوٹوں پر بڑی شفقت ومحبت فرماتے تھے۔ ان کا حوصلہ بڑھاتے۔ ان کو اونچی سے اونچی تعلیم حاصل کرنے کی طرف توجہ دلاتے۔ اس سلسلے میں جو مفید مشورہ ہوتا، اس سے دریغ نہ فرماتے، اگر کسی کو مالی مدد کی ضرورت ہوتی، تو اس کا انتظام کرنے کی کوشش کرتے۔

وہ اپنے رشتے داروں، پڑوسیوں کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ خاص کر اپنے ماں باپ کی بڑی خدمت کرتے تھے۔ ان کی چھوٹی بڑی ضرورتوں کو بڑے اہتمام سے پورا کرتے۔ ان کی دعائیں لیتے۔ رات میں سونے سے پہلے جب تک اپنی والدہ کے پاؤں نہ دبالیتے، وہ بستر پر نہیں جاتے تھے۔ اپنے بھائیوں سے بڑی محبت کرتے تھے۔ بھائیوں کو بھی ان سے بڑی محبت تھی۔ سب بھائی دوستوں کی طرح گھل مل کر رہتے تھے۔ وہ بیوی کے حق میں بہترین شوہر اور اپنے بچوں کے لیے شفیق ومہربان باپ تھے۔ وہ ان سے بہت زیادہ پیار کرتے تھے۔ ان کو سینے سے چمٹاتے۔ ان کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھتے۔ ان کو عزت دیتے۔ ان کی ہر جائز خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتے۔ کبھی کبھی ان کے منھ میں اپنے ہاتھ سے لقمہ رکھتے۔ خاص کر ان کی تعلیم کے لیے وقت ضرور دیتے اور ان کی تربیت میں گاہے شبنم اور گاہے شعلہ بن جاتے؛ لیکن مزاج میں لینت وشفقت اور نرمی ومحبت غالب تھی۔

ان کو ملت اور امت کا بڑا درد تھا۔ اس کو فائدہ

پہنچانے کی پوری کوشش کرتے تھے۔اس کے بہتر مستقبل کے بارے میں سوچتے رہتے تھے ۔ان کی بڑی خواہش تھی کہ کوئی بھی مسلمان بچہ علم سے محروم نہ رہے۔کوئی نوجوان بے روزگار نہ رہے۔کوئی بیوہ،غریب،محتاج بے سہارا نہ رہے،اور یہ درد ان کا کوئی نیا نہ تھا؛ بلکہ زمانۂ طالب علمی سے ہی وہ دل درد مند،فکرار جمنداورزبان ہوشمندر کھتے تھے،گویا:

کوئی بزم ہو،کوئی انجمن ،یہ شعار اپنا قدیم ہے
جہاں روشنی کی کمی ملی ،وہیں ایک چراغ جلادیا

مولانا مرحوم سماج کے کمزوراوردبے کچلےلوگوں کی تعلیم ومعاش کے بارے میں بہت زیادہ فکر مند رہا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے محلے والوں کو بڑا متحرک (Active) کردیا تھا۔مولانا کے رخصت ہوجانے کے بعد محلے والے ان کے مشن اور چھوڑے ہوئے منصوبوں کومکمل کرنے کے لیے مولانا غزالی ویلفیئر سوسائٹی کے بینر تلے منظّم طور پر سنجیدہ کوشش میں مصروف ہیں۔

ان تمام خوبیوں کے ساتھ وہ ایک زندہ دل،شگفتہ مزاج ،خوش فکر،نکتہ آفریں اور بذلہ سنج انسان تھے۔ان کی سنجیدہ مجلس میں بھی بڑا جی لگتا تھا۔کبھی کبھی وہ لطیفوں اور ظریفانہ نکتوں سے حاضرین کومحظوظ کرتے تھے۔ان کی آواز میں نغمگی اور دل کشی تھی۔ان کا طرز تخاطب بڑا دل پذیر تھا۔ان کی باتوں سے ہر خیال اور ہر قماش کے لوگ لذت اندوز ہوتے تھے۔ان کی تلاوت کالحن آج بھی کانوں میں شہد ٹپکاتا ہے:

سخن کا نغمہ باقی ہے ،سخن کا ساز باقی ہے
زباں خاموش ہے ؛لیکن ،تری آواز باقی ہے

''وہ بہت کچھ تھے؛مگر سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اپنے ہر دوست، ہر ہم عصر، ہر رفیق کے محبوب حبیب تھے۔ان کا ہر ملنے والا یہی سمجھتا تھا کہ وہ اسی سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ان کی ہستی،محبت کی آئینہ خانہ تھی، ہر آئینۂ دل میں وہی ہر طرف چلتے پھرتے نظر آتے تھے''۔

ان کے اوصاف کی تشریح کہاں تک کیجیے
تھے وہ ایک بندۂ مقبولِ خداوند کریم
روز اول سے ہی مرحوم کے لمحات حیات
خدمتِ قوم کے شعبوں میں ہوتے تھے تقسیم

خلاصہ یہ کہ وہ ایک بہت اچھے انسان، بہت اچھے دوست ، بہت اچھے شاگرد، بہت اچھے استاد، بہت اچھے شوہر، بہت اچھے باپ، بہت اچھے بیٹے ، بہت اچھے بھائی اور بہت اچھے عالم تھے،اسی لیے اللہ نے ان کو بڑی مقبولیت اور محبوبیت سے نوازا تھا۔ان کے جنازے میں لوگوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی ،جس میں ہر طبقے کے لوگ شامل تھے۔ کوئی بندہ ایسا نہ ملا جوان کا ذکر خیر نہ کررہا ہو۔اوران سے تعلق رکھنے والے سب ہی ان کی جدائی پر آنسو بہارہے تھے۔واقعی 'اے سراپا خلق! تیری ذات تھی ہر دلعزیز!'

دل تو یہی چاہتا ہے کہ قلم دفتر کا دفتر سیاہ کردے؛ لیکن آہ! کاغذ کے صفحات میں وہ وسعت کہاں جو ہمارے سینوں میں ہے۔سب لوگ تو یہی کہہ اور سمجھ رہے ہیں کہ مولانا مرحوم کا مدفن دوگز زمین ہے؛لیکن میں کیسے کسی کو بتاؤں کہ ان کا مزار درحقیقت میرے دل میں ہے! ان کا خلوص ومحبت میرے دل میں نور کی طرح روشن ہے۔''یادوں کی ایک گزرگاہ ہے جس میں رفاقتوں کے چراغ جگمگارہے ہیں۔مجھے محسوس ہوتا ہے کہ مولانا میرے سامنے کھڑے ہیں، میرے احوال دریافت کررہے ہیں ،اپنے محبت بھرے اور پرخلوص جذباتی اظہار سے مجھے آبدیدہ کررہے ہیں''۔آہ!'جب نام تیرا لیجیے تب چشم بھرآوے'۔

مولانا کی موت ایک فرد کی نہیں، فرد فرید کی موت ہے۔ایک شخص کی نہیں، ایک کارواں کی موت ہے۔علم وفضل کی موت ہے۔حسن اخلاق کی موت ہے۔اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قوم وملت کا خسارہ ہے:

وما كان قيس هلكه هلك واحد
ولكنه بنيان قوم تهدما

اب ایسا علم دوست اور دوست پرور بھائی کہاں سے لاؤں؟ ان جیسا ہم خیال وہم ذوق رفیق اب کہاں تلاش کروں؟ اب ہماری کون علمی سرپرستی کرے گا؟ کون ہماری عملی نگرانی کرے گا؟ کون مشکل عبارتوں کو منٹوں میں حل کرے گا؟ کون حوصلہ افزائی اور تحسین کے دو بول کے ذریعے ہماری علمی ترقی میں مدد کرے گا؟ کون ہماری ٹوٹی پھوٹی تحریروں کا خیر مقدم کرے گا؟ ان جیسے فہیم وفطین، ذہین وطباع، زیرک ودانا، معاملہ فہم اور حاضر العلم سرپرست کو اب کہاں ڈھونڈوں؟ ان جیسے مخلص مشیر، اور غمخوار ودم ساز دوست کو اب کہاں تلاش کروں؟

یہ زندگی کا دشت، یہ محرومیوں کی آنچ
بیٹھوں کہاں، کہ سایۂ دیوار بھی نہیں

غالب کے ایک شاگرد ''عارف'' ہوا کرتے تھے، جو جوانی ہی میں داغ مفارقت دے گئے۔غالب پر اس سانحے کا بڑا اثر ہوا، اور ان کے دل کی ٹیس، شعر کے قالب میں ڈھل کر اس طرح باہر نکلی:

ہاں اے فلک پیر! ''جواں تھا'' ابھی ''عارف''
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

آج ہم بھی اسی مضمون کو دہراتے ہیں؛ پر شاعرانہ اسلوب میں نہیں، نثر یہ پیرائے میں، اور کہتے ہیں کہ ہمیشہ جینے کے لیے کون آیا ہے؟ تو بھلا مولانا کیسے ہمیشہ جیتے رہتے؟ لیکن ان کے کچھ اور جینے سے فلک پیر کا کوئی نقصان نہ ہوتا اور ہم دوستوں کو، ان سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا۔ اب جدھر دیکھتا ہوں، دھوپ ہی دھوپ ہے:

اب ساری زندگی ہے کڑی دھوپ کا سفر
ایک پیڑ سایہ دار تھا، وہ بھی گزر گیا

لیکن کیا کیا جائے:

'قضا آتی ہے جب، دیتی نہیں اک پل بھی جینے کو'

اے عالم بقا کے مسافر! تیری روح کو سلام! اللہ تجھے جنت الفردوس میں جگہ نصیب فرمائے۔تری قبر کو نور سے بھر دے۔تری روح پر اپنی مغفرت کا پھول برسائے۔اللہ کی کریم ذات سے پوری امید ہے اس نے تجھے ان خوش نصیب بندوں میں شامل کر دیا ہوگا جن کے بارے میں قرآن نے کہا کہ ((يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ بِمَا غَفَرَلِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ)) [یٰسین:۲۷-۲۶] ''کاش! میری قوم کو یہ بات معلوم ہو جاتی کہ میرے رب نے مجھے بخش دیا ہے اور مجھ کو باعزت بندوں میں شامل فرمالیا ہے''۔

تجھے رخصت ہوئے، ایک مہینے سے زائد ہو گیا، لیکن ہمہ وقت دل کے آئینہ خانے پر تیری تصویر ڈوبتی اور واضح فرقت کو تازہ کرتی رہتی ہے اور یہ کہتی رہتی ہے:

ممکن نہیں کہ یاد ہماری نہ آسکے
ہم وہ نہیں کہ جن کو زمانہ بھلا سکے

☆☆☆

نقوش و تاثرات

میرے خورشید یہ موقع نہیں تھا ڈوب جانے کا

ابوطلحہ بنارسی ندوی

آدمی نشۂ غفلت میں بھلا دیتا ہے
ورنہ جو سانس ہے پیغام فنا دیتا ہے

موت کی حقیقت سے کون ناواقف ہے، ہم شب وروز اس کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں، انسان دنیا میں چاہے جتنی لمبی زندگی گزار لے، بالآخر ایک دن راہی عدم تو ہونا ہی ہے۔ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ۔(سورہ انبیا:۳۴)(اور اے پیغمبر(ﷺ) آپ سے پہلے بھی ہم نے کسی کو ہمیشہ زندہ رہنے کے لیے نہیں بنایا ہے) یہ دنیا فنا کے داغ سے داغ دار ہے، موت تو ایک دیوار ہے جو زندوں اور مردوں کے درمیان کھڑی کردی جاتی ہے، کسی کے انتقال پر غم کا ہونا ایک فطری جذبہ ہے؛ لیکن کسی کو بہت جلدی بھلا دیا جاتا ہے، تو کسی کے جانے کا غم کچھ زیادہ طویل ہوتا ہے، اور ان کا جانا دل کو اندر تک جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ میری کیفیت بھی کچھ ایسی ہی ہے، بھائی غزالیؒ کے انتقال کو مہینہ پورا ہونے کو آیا، مگر طبیعت پر اس کا ایسا گہرا اثر ہے جو کسی کے انتقال پر نہیں ہوا ع

یہ مجھے چین کیوں نہیں آتا
ایک ہی شخص تھا جہاں میں کیا

ایسے وقت میں تسلی کا جو سامان ہو سکتا ہے وہ ہمارا یہ نظریۂ حیات ہے کہ نیک انسان کے لیے موت اس کی زندگی کا خاتمہ نہیں؛ بلکہ ایک خوب صورت زندگی کی ابدی شرعات ہے ع

موت عیش جاویداں کا آخری پیغام ہے

بھائی غزالیؒ کے انتقال پر ہر کس و ناکس کو بلکتا اور ذکر خیر کرتا دیکھ ایسی موت پر کس کو رشک نہیں آتا ہوگا، ان کی زندگی اور ان کی موت ہم سب کے لیے سامان عبرت ونصیحت ہے:

دقات قلب المرء قائلة له
إن الحيلة دقائق وثواني
فارفع لنفسك بعد موتك ذكرها
فالذكر للانسان عمر ثاني

''انسان کے دل کی دھڑکنیں اس سے کہہ رہی ہیں کہ تیری زندگی چند ساعتوں کا نام ہے۔ اپنے آپ کو مرنے کے بعد ذکر خیر کے قابل بنالے، کیوں کہ موت کے بعد انسان کا ذکر خیر ہی اس کی حیات ثانیہ ہے''۔

بھائی غزالیؒ سے میری ملاقات:

بھائی غزالیؒ سے میری ملاقات مدرسۃ العلوم الاسلامیۃ، علی گڑھ میں ۲۰۱۰ء میں ہوئی، مولانا اپنے مخصوص مزاج اور حسن اخلاق کی وجہ سے سب کے چہیتے تھے، میری بھی ان سے نزدیکیاں بڑھتی چلی گئیں، مولانا کے اخلاق عالیہ کا یہ کمال تھا کہ ہر ایک خود کو ان سے قریب تر ہی سمجھتا تھا، شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ جس کا تعلق اللہ سے بہت گہرا ہوتا ہے، اس کا تعلق اللہ کے بندوں سے بھی اللہ کے لیے بہت گہرا ہو جاتا ہے:

مجھے کسی سے محبت نہیں کسی کے لیے
میں کسی سے محبت کروں کسی کے لیے

بھائی غزالیؒ سے مزید قربت تب ہوئی جب وہ غالباً ۲۰۱۴ء کے اواخر یا ۲۰۱۵ء کے اوائل میں مجھ سے کہنے لگے کہ: طلحہ بھائی! میرا ایک خواب ہے کہ ہم لوگ عوام سے جڑیں، اور لوگوں کی کچھ خدمت کرسکیں۔ میری بڑی خواہش ہے کہ میں ایک اکیڈمی

اور ذاتی پبلیکیشن شروع کروں، فی الحال تو ان سب کے لیے نہ تو اسباب موجود ہیں اور نہ ہی فراوانی ہے؛ لیکن ہر کام کی ایک ابتداء ہوتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس میں میرا ساتھ دیں۔ بلاشبہ یہ میری خوش قسمتی تھی۔ اللہ جل جلالہ نے بھی شرح صدر فرمایا، اور میں نے فوراً ہی ہامی بھر لی۔ اس طرح اس مبارک کام کا آغاز ہوا۔ اور بھائی غزالی کے گھر سے ہی بعد نماز مغرب اکیڈمی کے کام کی شروعات ہوئی، یہ سلسلہ تقریبا دو سال پر محیط رہا۔ اس کے بعد اللہ تعالی نے وسعت بخشی، اور مولانا کی فکر وگن سے باقاعدہ اکیڈمی کا ایک کرایے کے فلیٹ سے آغاز ہوا، جس میں ہمارے دیگر فاضل رفیقان اکیڈمی بھی شامل ہوئے، اور اکیڈمی کا نام امام بخاری ریسرچ اکیڈمی ہونا طے پایا۔

بھائی غزالیؒ جس طرح امت کی اخلاقی خستہ حالی کے بارے میں فکر مند تھے، وہیں منکرین حدیث اور مستشرقین کی جانب سے بھی پریشان رہا کرتے تھے، جس کی جڑیں دھیمے دھیمے علی گڑھ میں مضبوط ہوتی جارہی ہیں، اس لیے ابتداء ہی سے انھوں نے اکیڈمی میں کاموں کو مزاجوں کے اعتبار سے تقسیم کیا، اور خود منکرین اور مستشرقین کے موضوع پر اپنے کام کا آغاز کیا، اور ان کی یہ تحقیقی کاوش مختلف مراحل سے گذرتی رہی، بالآخر ایک مدلل اور محقق کتاب اپنے انجام کو پہنچی، جس کی کمپوزنگ و سیٹنگ مکمل کر کے بھائی غزالیؒ کے انتقال سے ایک ماہ قبل ۱۱ رمضان المبارک کو اس خادم نے ان کے سپرد کیا اور مجھے آج بھی یاد ہے کہ باقاعدہ لڑتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ جلد از جلد اس کے پروف اور حوالوں پر نظر ڈال کر فائنل کریں، عید بعد آتے ہی اس کتاب کو طباعت کے لیے جانا ہے، ورنہ میں اب اس کتاب کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا، اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! (یہاں میں یہ بتاتا چلوں کہ مولانا کے والد محترم کی یہ دلی خواہش تھی کہ ان کی زندگی میں غزالی کا کوئی ایک کتابچہ ہی سہی؛ مگر ضرور شائع ہو جائے، میں نے اس کا بھی حوالہ دیا اور کہا تھا کہ مولانا کب تک اکیڈمی سے دوسروں کی کتابیں ہی آتی رہیں گی، اور وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنستے ہوئے کہتے رہے: ان شاء اللہ مولانا، اس بار اسی پر کام کرنا ہے، مزید یہ بھی کہا تھا کہ استغفر اللہ، اس لیے نہیں کہ میری کتاب آجائے؛ بلکہ اس لیے کہ اس موضوع کو عام کرنے کی ضرورت ہے، مگر کسے معلوم تھا کہ جس میں ان کی زندگی کے قیمتی چار پانچ سال لگے، وہ کتاب ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکے گی۔

بہر کیف اکیڈمی کے ان ابتدائی مراحل میں بھائی غزالیؒ سے میرا تعلق مزید گہرا ہوتا چلا گیا تھا، میری ایسی کوئی بات نہیں تھی جس سے وہ واقف نہ ہوں، اور ان کے مشوروں نے مجھے سہارا نہ دیا ہو، انھوں نے بڑے بھائی کی ہر کمی پوری کی تھی، میں ان سے لڑتا بھی تھا، وہ مناتے بھی تھے، ڈانٹ بھی دیتے تھے؛ مگر ان سب میں ایسا پیار اور اپنائیت تھی جو مجھے آج تک کسی سے نہیں ملی۔

بھائی غزالیؒ اپنے پرکشش انداز، مسکراتے چہرے اور زندہ دلی کی وجہ سے ہر محفل کی جان ہوا کرتے تھے، میرے گھر کی شاید ہی کوئی تقریب ایسی ہوگی جس میں بھائی غزالیؒ شریک نہ ہوئے ہوں؛ بلکہ کبھی وقفہ ہو جاتا تو مزاحاً فرمایا کرتے تھے کہ طلحہ بھائی کی اہلیہ بریانی اور کباب بہت اچھا بناتی ہیں۔ وہ میرے گھر کے ایک فرد تھے، محفل چاہے مدرسہ کے احباب سے سجی ہو یا اکیڈمی کے رفقاء سے، میرے مخصوص محبین کی یا رشتہ داروں کی، مولانا نہ صرف تشریف نہ لاتے؛ بلکہ مختلف مزاج کے لوگوں میں ایسے گھل مل جاتے، جیسے ان لوگوں سے کافی پرانی پہچان ہو، اپنی طبیعت کی فطری شرافت، حد درجہ سادگی وتواضع، والہانہ پرتپاک انداز، زندہ دلی اور خوش مزاجی کی وجہ سے وہ نہ صرف محفل کی جان بن جاتے؛ بلکہ اپنا ایک خاص اثر چھوڑ جاتے تھے، اسی لیے ان کے انتقال کی خبر سے ہر اس شخص کو دھچکا لگا جو ایک ملاقات کے بعد ہی سے ان کا دیوانہ ہو چکا ہوتا تھا۔ میری والدہ روئیں، میرے والد محترم جناب مولانا احمد نصر بنارسی اطال اللہ بقاءہ نے اس خبر پر جس طرح تکلیف کا اظہار کیا وہ اپنے کسی قریبی محبّ کے لیے ہی ہو سکتا تھا۔ والد محترم جب بھی علی گڑھ تشریف لاتے، ہمیشہ بھائی غزالی جتنا وقت مل پاتا، والد صاحب کے ساتھ ہی رہتے، ایسا ادب کرتے جیسے انھی کے والد ہوں، ادب کے ساتھ دل جیت لینے کا ہنر کوئی ان سے سیکھتا۔ بھائی

غزالیؒ کی حیات میں جب میری فیملی ان کے یہاں دعوت پر گئی تب اپنی کم گوئی کی عادت کے باوجود واپسی پر میری اہلیہ بار بار اور کئی دن تک یہ دہراتی رہی تھی کہ غزالی بھائی کی امی ان کی تعریف کرتے نہیں تھک رہی تھیں، اور کہہ رہی تھیں کہ اللہ اگر اولاد دے تو غزالی جیسی دے، والدین کی فکر، خدمت، محبتوں بھرا نرم لہجہ، بیوی بچوں کے ساتھ بے حد پیار بھرا اور لاڈ اٹھانے والا سلوک، بھائیوں اور خاندان والوں کو ساتھ لے کر چلنے والا بچہ اللہ ہر ایک کو دے۔ع

سویا وہ زیر خاک تو اک عہد سو گیا
ہر رنگ کی بہار کا منظر تھی اس کی ذات

مولانا علمی لیاقت میں جس طرح ہم سب کے لیے مرجع تھے، وہیں اپنی عملی زندگی میں بھی ہمارے لیے ایک مثال تھے، ان کی حیات میں بھی ہم لوگ ان کے اخلاق کے دیوانے تھے، ورنہ آج کے دور میں علمی لیاقت کے حاملین تو بہت مل جائیں گے؛ لیکن علم وعمل کا ایسا امتزاج، ایسا خوب صورت سنگم نادر ہی ہے۔ میری ان سے دس سالہ فراقت میں کبھی ایک بار بھی ایسا نہ ہوا، کہ میرا دل ان کی طرف سے دکھا ہو، یا بد دل ہوا ہو، بسا اوقات مولانا اگر ٹوک بھی دیتے تو بعد میں آ کر کہا کرتے کہ طلحہ بھائی، آپ کو برا تو نہیں لگا، اور اس طرح ناز برداری کیا کرتے تھے جیسے ان سے کوئی غلطی ہو گئی ہو؛ جب کہ مولانا کا ٹوکنا میں کب کا بھول چکا ہوتا تھا، وہ کہا کرتے تھے کہ طلحہ بھائی میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کسی کا بھی دل دکھے۔ ایسی کسر نفسی اور تواضع میں نے تو آج تک کسی میں نہیں دیکھی۔ ان کی ایسی مثالی عملی زندگی ہمیں دعوت عمل دیتی ہے، آج ہر ایک ان کی مدح سرائی کرتا دکھائی دے جا رہا ہے، ایسی جنتی زندگی بسر کرنے والے کی زندگی پر چند سطریں لکھنے کی ہمت کرنے کی صرف ایک وجہ ہے کہ کاش ہم سب بھی اپنی زندگی کو اسی طرح نبوی سانچے میں ڈھال سکیں۔ ایسی قابل رشک زندگی اور اس سے کہیں زیادہ قابل رشک موت نے ہمیں جو درس دیا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ایک مؤمن کی زندگی جیسی بیان فرمائی ہے، بھائی غزالیؒ اس کا جیتا جاگتا ثبوت تھے۔

افسوس کہ ان کے انتقال کے وقت میں بنارس میں تھا، ان کے وفات کی خبر نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میرے استاد، میرے محسن، میرے مربی حضرت مولانا عبداللہ حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد اگر کسی کا اس دنیا سے چلا جانا مجھ پر سب سے زیادہ شاق گزرا تو وہ بھائی غزالیؒ کا تھا۔ سچ کہتا ہوں کوئی دن ایسا نہیں جاتا، جب ان کی یاد نہ آتی ہو، دل روتا ہے، ان کی باتیں، ان کا اپنا انداز، ان کی مسکراہٹ آج بھی آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ وہ صرف ایک اچھے انسان نہیں تھے بلکہ ایک چلتا پھرتا مشن، ایک کام اور ملت کی ضرورت تھی، اللہ کا فیصلہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے اور اسی میں خیر بھی ہے؛ مگر ابھی تو انھوں نے کام کرنا شروع ہی کیا تھا، ابھی تو بہت سے کام کرنے تھے:

فکر و فن کا آج بھی ہوتا جہاں اس کے اسیر
پیش آتا اگر نہ اس کو ناگہانی حادثہ

ان کی رہنمائی میں ہم جیسے ناکارہ بھی کسی کام کے ہو جاتے، اب تو ہمت ٹوٹ سی گئی ہے، اب کون حوصلہ دینے والا ہے، کون کام کروانے کا ہنر جانتا ہے، کون ہوش میں لانے والا ہے، کسے اتنی فرصت ہے؟ یہ ایک سرپرست، ایک مخلص داعی، ایک پر خلوص بھائی اور ایک ایسے عالم کی موت ہے جس کا نقصان بہت بڑا ہے۔ آج جب میں اپنے چاروں اور دیکھتا ہوں تو مجھے کوئی ایسا نظر نہیں آتا جس کے پاس جا کر اپنا دل نکال سکوں، اس خود غرض اور انانیت کے دور میں ان جیسا بے غرض اور بے لوث بھائی کہاں سے تلاش کروں، مجھے ان سے محبت تھی، سچی محبت۔

اللہ بھائی غزالیؒ کی اہلیہ اور ان کے بچوں اور گھر والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے، ان کا سہارا اور مددگار بنے، اور بھائی غزالیؒ کی مغفرت فرمائے اور ہمیں بھی توفیق دے کہ ہم ان کے مشن کو صحیح طریقہ پر انجام دے سکیں۔

جمالك فی عینی و حبك فی قلبی
وذكرك فی فمی فأین تغیب

☆☆☆

❑ لائحہ عمل

اٹھ کہ پھر خورشید کا سامان سفر تازہ کریں

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

(ذیل میں ''حالات حاضرہ: مسائل اوران کا اسلامی حل'' کے موضوع پر پروفیسر محسن عثمانی ندوی کی تقریر پیش کی جارہی ہے جو مرکزی جماعت اسلامی دہلی کی مسجد اشاعت اسلام میں 9/جون 2019ء بروز اتوار اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب اور اراکین جماعت اور طلبہ کے سامنے کی گئی۔)

مسلمان تاریخ کے نہایت نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ ہمیں بہت سنجیدگی سے غور کرنا ہے کہ ہم ان حالات کے بھنور سے کیسے نکلیں اور کس طرح عزت اور عافیت کے ساحل تک پہنچیں۔ ابھی چند ہی دن گزرے ہیں کہ گائے کا گوشت رکھنے کے شبہ میں کچھ اشخاص کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور جبراً ان سے ''جے شری رام'' کے نعرے لگوائے گئے۔ سادھوی پرگیہ سنگھ ٹھاکر نے گوڈسے کو جو کہ گاندھی جی کا قاتل تھا اپنا مرکز محبت وعقیدت بتایا اور پارلیامنٹ میں حلف لیتے ہوئے بھارت ماتا کی جے کا نعرہ لگانے کی روایت قائم کرنے کی کوشش کی۔ ریاست بہار میں گری راج سنگھ نے وہاں کے ہندو وزیر پر تنقید کی جس نے مسلمانوں کے لیے افطار پارٹی کا انتظام کیا تھا، بہار میں ایک نوجوان محمد برکت عالم کی پٹائی اس لیے ہوئی کہ وہ مسلمان تھا اور سر پر ٹوپی پہنے ہوئے تھا، اسے بھارت ماتا کی جے کہنے کے لیے کہا گیا۔ ایک پھیری لگانے والے مسلمان کو گولی ماردی گئی اور کہا گیا تم کو پاکستان چلے جانا چاہئے تھا۔ مدھیہ پردیش میں ایک ہندو نے ایک مسلمان مزدور کو اکیلا دیکھ کر پکڑ لیا پھر اس کو قتل کر دیا پھر اس کا ویڈیو بنا کر سوشل میڈیا پر وائرل کر دیا، نجیب آباد میں ایک بی ایس پی لیڈر حاجی احسان اپنے دفتر میں قرآن پڑھ رہے تھے ان کو مسلمان ہونے کے جرم میں گولی ماردی گئی، بلرام پور میں کچھ مسلمان نوجوانوں کی ایک بھیڑ نے پٹائی کر دی اور ان پر الزام لگایا کہ وہ 'پاکستان زندہ باد' کا نعرہ لگا رہے تھے۔ پونے کے ایک ڈاکٹر اُودے گور دہلی آئے اس وقت وہ کناٹ پیلیس کے قریب ٹہل رہے تھے کچھ شر پسندوں نے انھیں مسلمان سمجھ کر روکا اور ان کو 'جے شری رام' کا نعرہ لگانے کے لئے کہا گیا، ایک مسلمان مزدور کو کسی بہانے سنسان جگہ پر لے گئے اور پھر اس مزدور کے ٹکڑے کر دیئے گئے، ایک صاحب جو ابھی نائب وزیر داخلہ بنے ہیں اور تلنگانہ سے کامیاب ہوکر آئے ہیں انہوں نے حیدرآباد کے پرانے شہر کو جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے دہشت گردی کا اڈہ قرار دیا ہے۔ کئی برس سے اسکولوں میں مسلمان بچوں سے 'سوریہ نمسکا' میں شریک ہونے کے لیے کہا جاتا ہے جب کہ سوریہ نمسکار ایک ہندو عبادت ہے اور اس میں سورج کے دیوتا ہونے کا تصور ہے۔ بہت سے شہروں میں مسلمانوں کو دہشت گردی کے الزام میں پکڑ لیا جاتا ہے اور طویل عرصے تک

انہیں جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔فرضی انکاؤنٹر کے بہت سے واقعات پیش آئے ہیں۔آر ایس ایس جو بی جی پی کی اصل تربیت گاہ ہے اور سرچشمہ فیضان ہے وہ ہندستان کو 'ہندو راشٹر' بنانا چاہتی ہے اور دستور کے بدل دینے کا عزم رکھتی ہے۔وہ اپنے ارادے کی تکمیل کے قریب پہنچ گئی ہے۔راجیہ سبھا میں بی جے پی کی اکثریت جس دن ہو جائے گی اس دن اس پوزیشن میں ہوگی کہ دستور کو بدل دے اور ہندو راشٹر ڈکلیئر کر دے اور مسلمانوں اور اقلیتوں کو ووٹ دینے کے حق سے محروم کر دے۔اُس وقت ہندستان میں مسلمان دستوری طور پر دوسرے درجے کے شہری ہو جائیں گے۔اپنے مذہب پر عمل کرنے سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ان کا 'پرسنل لا' ختم ہو چکا ہوگا۔صرف بابری مسجد ہی نہیں بلکہ دوسری مسجدوں پر اکثریت کا یعنی ہندوؤں کا قبضہ ہوگا۔مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ کا اقلیتی کردار آج بھی خطرے میں ہے اور آئندہ ان کے تعلیمی اداروں کو اور ان کی دینی جماعتوں کو بند کر دیا جائے گا اور ان پر بے پناہ مظالم ہوں گے۔یہ سارے خطرات اب سر پر منڈلا رہے ہیں اور اسپین کی تاریخ میں جو کچھ ہوا اس ملک میں بھی دہرایا جا سکتا ہے۔اسپین میں مسلمانوں نے سات سو پچاس (750) سال حکومت کی۔اس کے بعد ان کی حکومت کا چراغ گل ہو گیا۔مسلمانوں کو زبردستی عیسائی بنایا گیا اور جو عیسائی بننے کے لیے تیار نہیں ہوئے انہیں ختم کر دیا گیا یا ملک سے نکال دیا گیا۔ہم اس ملک میں ان ہی حالات سے گزر رہے ہیں۔ہمیں بے حد سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیے کہ ہم کو کیا حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے اور اپنے ایمان کی اور جان کی کس طرح حفاظت کرنی چاہیے۔ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو ابھی تک سنگین حالات کا شعور نہیں ہے اور وہ بے حسی اور بے شعوری کی حالت میں زندگی گزار رہے ہیں۔

ہمیں پوری سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کرنا چاہیے کہ وہ قوم جو اس ملک میں تاج وتخت کی مالک تھی اور سریر آرائے سلطنت تھی کیوں کر مظلومیت اور بے عزتی کی آخری حد تک پہنچ گئی۔کیوں کر اس کی زندگی کی عمارت ایک ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئی۔اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہمیں اپنی تاریخ پر ایک نظر ڈالنی ہوگی۔پہلی صدی ہجری میں اسلام کا آفتاب طلوع ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ پر ایمان لانے والے صحابہ کرامؓ نے اس طاقت وقوت کے ساتھ کفار اور مشرکین کے درمیان توحید کا صور پھونکا کہ فتح مکہ کے بعد پورا جزیرۃ العرب حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔اور جزیرۃ العرب کے گرد وپیش جتنے ملک تھے وہ سب دین اسلام میں داخل ہو گئے، صحابہ کرام کے طاقتور ایمان کے سامنے سب بے بس ہو گئے۔اور جب سرزمین حجاز اور اس کے قرب وجوار کے تمام ممالک مفتوح ہو گئے اور دین اسلام کی دعوت نے ان کے دلوں کو جیت لیا اور سب مسلمان ہو گئے یا ان کی غالب اکثریت نے اسلام قبول کر لیا تو پھر وہ کام شروع ہوا جو مشیت الٰہی کے مطابق تھا یعنی علوم اسلامیہ کی تدوین کا کام، جس دین کو قیامت تک باقی رہنا تھا اس کے لئے اس کے علوم کو مدون ہونا ضروری تھا۔دوسری تیسری چوتھی ہجری میں دنیا کے رقبہ زمین کے ایک بڑے حصے میں اسلام کا علم لہرا رہا تھا۔علوم اسلامیہ کی تدوین بہت بڑے پیمانے پر ہوئی۔صحاح ستہ کی تدوین ہوئی، فقہائے اسلام نے اسلامی قوانین مرتب کئے۔تفسیر اور سیرت کی کتابیں لکھی گئیں، علم کلام وجود میں آیا اور اسلامی علوم کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جس میں جید نامور علماء سامنے نہ آئے ہوں۔ان سب کے ساتھ تمدن کی تعمیر اور

سائنس کی ترقی کا زمانہ شروع ہوا۔

اسلامی تاریخ کے اس سفر سے ہم نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جب مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہو اور وہ کافر و مشرک اکثریت کے سمندر میں زندگی گزار رہے ہوں تو ان کی ترجیحات میں سب سے پہلی ترجیح اسلام کا پیغام پہنچانا ہے۔ اور توحید کی دعوت دینا ہے اور یہ دعوت قوم کے درمیان لسانِ قوم میں دی جانی چاہیے۔ کیونکہ دنیا کی تاریخ میں جتنے رسول آئے وہ سب اپنی قوم کو لسان قوم میں دعوت دینے آئے تھے۔ اور جب اس دعوت کے نتیجے میں پوری قوم یا اس کی اکثریت اسلام قبول کر لیتی ہے تو اس کے بعد علوم اسلامیہ کی تدوین اور تمدن و تہذیب کے فروغ کا دور شروع ہوتا ہے۔ کفر و شرک کے قلعوں کو مسمار کرنا، توحید کی منادی کرنا، اللہ کی عبادت کے پیغام کو اللہ کے بندوں کو پہونچانا، یہ وہ کام ہے جس پر اللہ کی نصرت نازل ہوتی ہے، اللہ تعالی فرماتا ہے: **ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم** (سورہ محمد) یعنی اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدم کردے گا۔ انسان کمزور ضعیف البنیان اللہ جیسی قوی اور قاہر ذات کی مدد کیسے کرسکتا ہے۔ یہاں اللہ کی مدد کا مطلب اللہ کی عبادت اور اس کی وحدانیت کو دنیا میں پھیلانا ہے، کیونکہ اللہ زبردستی لوگوں کو اپنا فرماں بردار اور عبادت گذار نہیں بناتا ہے اس نے ہر شخص کو عمل کی آزادی دی ہے۔ وہ انسانوں کے ذریعہ اپنی فرماں برداری کا پیغام اپنے بندوں تک پہونچاتا ہے اور اسی کام کے لئے وہ پیغمبروں کو بھیجتا ہے۔ پیغمبری کے سلسلہ کے بند ہونے کے بعد یہ علماء امت کا کام ہے کہ وہ اس کام کو انجام دیں، لیکن ہمارے دینی مدرسے اس طرح کے علماء کو پیدا کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالی کے علم میں یہ بات ہے کہ حق کی دعوت اور وحدانیت کا پیغام لے کر جب اللہ کے بندے کھڑے ہوں گے تو رکاوٹیں بھی ڈالی جائیں گی۔ لوگ ان کے دشمن بھی ہو جائیں گی یہاں اللہ نے داعی گروہ کی رہنمائی کی ہے اور کہا ہے: **لا تستوی الحسنہ ولا السیئۃ ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک وبینہ عداوۃ کأنہ ولی حمیم ولا یلقاھا الا الذین صبر وا وما یلقاھا الا ذو حظ عظیم** یعنی نیکی اور بدی برابر نہیں ہوسکتی، برائی کو بہترین درجہ کی نیکی (حسن اخلاق) سے دفع کرو، اس سے تم یہ تبدیلی دیکھوگے کہ وہ شخص جس کے اور تمہارے درمیان عداوت تھی وہ تمہارا گہرا مددگار اور ولی بن گیا لیکن یہ مقام اور مرتبہ صرف ان ہی کو ملتا ہے جو صبر کرتے ہیں اور جو بڑے قسمت ور ہوتے ہیں۔ مذکورہ بالا دونوں آیتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کے موجودہ سنگین حالات دعوت اسلام کے ذریعہ اور برادران وطن کے ساتھ احسن درجہ کی نیکی اور حسن خلق کے ذریعہ ختم کئے جاسکتے ہیں قرآن مجید میں یہ بھی اللہ تعالی نے فرمایا ہے **وھو یتولی الصالحین** یعنی اللہ تعالی صالحین کی مدد کرتا ہے اور ان کی حفاظت کرتا ہے، اگر ملک میں ایسی صالحین کی جماعت وجود میں آجائے جو خود عبادت گذار ہو اور لوگوں کو اللہ کی عبادت کی دعوت دینے والی ہو تو اللہ کی مدد مسلمانوں کے شامل حال ہو جائے گی اور خطرات جو اس وقت سامنے آئے ہیں دور ہو جائیں گے۔

جزیرۃ العرب، مصر اور شام، عراق اور فلسطین اور ایران وغیرہ میں دعوت اسلام اور پیغام توحید کے اعلان اور فتوحات کے نتیجہ میں مسلمانوں کی جب اکثریت ہو چکی تب اس کے بعد وہاں علوم اسلامیہ، تمدن، سائنس اور صنعت وغیرہ کی ترقی کا کام ہوا۔ لیکن کام کی یہ ترتیب اسپین میں باقی نہیں

رہی اور، بعد کی تاریخ میں بھی باقی نہیں رہی۔ یعنی اقلیت میں ہونے کے زمانے میں دعوت توحید کا کام اور اکثریت میں آجانے کے بعد علوم اسلامیہ کی تدوین کا کام، یہ ترتیب ختم ہوگئی۔ اسپین یعنی اندلس کو مسلمانوں نے فتح کیا اور سیکڑوں سال حکومت کی لیکن مسلمان وہاں اکثریت میں نہیں آسکے، اقلیت میں رہے، فاتحین ومفتوحین کے درمیان میں کمیونیکیشن گیپ رہا، یعنی زبان کی خلیج حائل رہی اور قوم کے درمیان لسان قوم میں دین کی دعوت کا انجام نہیں پایا یعنی وہ کام نہیں ہوا جو مکی زندگی میں قرن اول میں انجام پایا تھا اگرچہ اندلس میں علماء بہت پیدا ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک وقت ایسا آیا جب مسلمانوں کو اندلس سے نکلنا پڑا۔ اور وہ مسجد قرطبہ اور مدینۃ الازہر اور اپنی تمام شاندار تاریخی عمارتوں کو چھوڑ کر افتاں وخیزاں ملک چھوڑ کر نکل گئے۔ جتنی طویل مدت مسلمانوں نے اندلس میں حکومت کی، اتنی ہی مدت ہندوستان میں بھی مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ ہے، یہاں بھی مسلمانوں نے قطب مینار، تاج محل بنایا، لال قلعہ تعمیر کیا اور یہاں بھی آخر میں مسلمانوں کی حکومت کا چراغ گل ہوگیا۔ پہلے انگریزوں نے اس ملک پر قبضہ کیا اور پھر 1857ء کی بغاوت ناکام ہوگئی۔ بہادر شاہ ظفر کو رنگون میں قید کیا گیا۔ اور جب انگریزوں کی حکومت ہندستان میں ختم ہوئی تو پھر ابتداء میں ایک سیکولر حکومت قائم ہوئی، جس میں اکثریت ہندوؤں کی تھی اور اب 'ہندوتوا'' کا زمانہ آیا ہے اب سیکولرزم کی مخالفت کا دور ہے اور اب اسپین کی تاریخ بتدریج دہرائی جارہی ہے۔ اسپین اور ہندستان دونوں جگہ دین اسلام کی دعوت کا وہ کام صحیح ڈھنگ سے نہیں ہوسکا جو قرن اول میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی کوششوں سے انجام پایا تھا، جب مسلمان چھوٹی سی اقلیت میں تھے۔ یہ سب سے زیادہ ضروری کام ہے جس کے لیے تمام انبیاء کرام کی بعثت ہوتی ہے۔ یہ کام نہ اسپین میں انجام پایا نہ ہندستان میں، اس طرح گویا تاریخ میں دین اسلام کی گاڑی کا derailment ہوا۔ یعنی گاڑی اپنی پٹری سے اتر گئی۔ انبیائی کام کا منہج باقی نہیں رہا۔

گاڑی اپنی پٹری سے کیوں اتری اس کو جاننے کے لئے پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ جس طرح ایک فرد اپنے شاکلۂ ذہنی mind set کے مطابق عمل کرتا ہے اسی طرح قومیں بھی اپنی شاکلۂ ذہنی یعنی mind set کے مطابق عمل کرتی ہیں۔ قرآن کی آیت اس حقیقت پر شاہد ہے ''کل یعمل علی شاکلتہ'' یعنی ہر شخص اپنے شاکلہ ذہنی کے مطابق عمل کرتا ہے۔ پہلی صدی ہجری کا شاکلۂ ذہنی mind set جسے آں حضرت ﷺ نے بنایا تھا وہ اسلام کی دعوت کا شاکلہ ذہنی تھا۔ پھر قوموں کے مسلمان ہونے کے بعد علوم اسلامیہ کی تدوین اور تمدن وسائنس کا شاکلہ ذہنی تیار ہوا جو ضروری بھی تھا اور اللہ کی مشیت بھی یہی تھی۔ لیکن اسپین اور ہندوستان میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے وہاں پہلی صدی ہجری کا اسلامی دعوت والا شاکلہ ذہنی واپس نہ آسکا ان دونوں جگہ مسلمانوں نے علمی کام بھی بہت کیے اور تمدن کو فروغ بھی بہت دیا اور ایک شاندار تاریخ کا نمونہ پیش کیا، لیکن یہ سارے کام انبیائی منہج سے دور تھے۔ انبیاء کرام قوموں کو جہنم کی آگ سے نجات دلانے کی کوشش کرتے ہیں، ان میں جو اسلام قبول کر لیتے ہیں ان کی تربیت کرتے ہیں، مسلمانوں نے انبیاء کا پہلا کام چھوڑ دیا اور صرف مسلمانوں کی تربیت وتعلیم پر توجہ مرکوز کی اور علمی کام انجام دئے۔

مولانا قاسم نانوتوی مسلمانوں کے دردمند رہنما

تھے انہوں نے دارالعلوم دیوبند قائم کیا اور اس طرز کے بہت سے مدرسے وجود میں آئے جن سے پڑھ کر ہزاروں کی تعداد میں ایسے علماء تیار ہوئے جو صرف مسجدوں میں اور مسلمانوں کے اجتماعات میں صرف مسلمانوں کے سامنے لسان المسلمین میں بلکہ لسان العلماء میں خطاب کر سکتے تھے۔ قوم سے، برادران وطن سے ،لسان قوم میں خطاب کرنے والے علماء سرے سے تیار ہی نہیں ہوئے ۔مولانا الیاسؒ کی امت کے لئے دردمندی میں کسے شک ہے،لیکن ان کے ذہن میں غیر مسلم تھے ہی نہیں انہوں نے مولانا محمد علی جوہر سے یہ فرمائش کی تھی کہ وہ انگریزی میں انگریزوں کو اسلام کی دعوت دیں۔لیکن انہوں نے خود جو تبلیغی تحریک شروع کی اس کے چھ اصولوں میں ''اکرام مسلم'' کا اصول تو موجود تھا لیکن ''دعوتِ غیر مسلم'' کا اصول غائب تھا ۔غیر مسلم ہمارے علماء کرام کے منصوبوں میں سرے سے شامل ہی نہیں تھے۔پہلی صدی والا شاکلہ ذہنی ایسا غائب ہوا کہ پھر واپس ہی نہیں آیا۔اسپین میں اسلام اور مسلمانوں کے خاتمے کی جو وجہ تھی وہی وجہ ہندستان میں بھی مسلمانوں کے زوال کی نظر آتی ہے۔یعنی انبیائی منہج تبلیغ سے گریز اور صرف مسلمانوں کو ہدف خطاب بنانا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی ایک ایسے ملک میں تھے جہاں غیر مسلموں کی غالب اکثریت تھی اور مسلمانوں کی حکومت و ہاں ڈاواں ڈول ہو رہی تھی، ایسے ملک میں انہوں نے اسرار شریعت پر'' حجت اللہ البالغہ'' جیسی شاندار اور بے نظیر کتاب لکھی۔ لیکن اسرار تبلیغ دین کے بارے میں اور کفر وشرک کی گہوارے میں لسان قوم میں توحید کی اذان دینے اور رسولوں کا طریق اختیار کرنے کے بارے میں اور اس کی ضرورت اور اہمیت پر انہوں نے کچھ نہیں لکھا۔اس اہم اور معرکہ آرا کتاب میں غیر مسلموں کو دعوت نہ دینے کے نقصانات کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔انہوں نے گاڑی کو دوبارہ پٹری پر ڈالنے کا اور غیر مسلموں میں توحید کی دعوت دینے کا مشورہ بھی مسلمانوں کو نہیں دیا۔وجہ یہ تھی کہ وہ بھی دوسری تیسری صدی ہجری کے مائنڈ سیٹ کے زیر اثر تھے۔یعنی علوم اسلامیہ کے موضوع پر کتابوں کی تصنیف پر ان کا ارتکاز تھا۔اس تصنیفی کام کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں، یہ کام ہونا چاہئے ،لیکن انبیاء کرام کے منہج دعوت کو ساتھ لے کر۔کفر وشرک کے خارزار میں قوم سے تعلقات قائم کر کے لسان قوم میں توحید کا پیغام لے کر۔وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه ۔ یہ قرآن کی آیت ہے جس کا مفہوم ہے کہ میں نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر یہ کہ وہ قوم کو لسان قوم میں دعوت دیتا تھا۔ ہمارے علماء کرام لسان قوم سے واقف ہی نہیں ان کے مدرسوں میں لسان قوم سکھانے کا انتظام نہیں، طلبہ کو برادران وطن کے عقیدوں سے واقف کرانے کی سرے سے ضرورت ہی محسوس نہیں کی جاتی، عقیدہ توحید کو پھیلانے اور لسان قوم میں تقریروں کی مشق طلبہ سے نہیں کرائی جاتی، خارجی مطالعہ کا کورس نہیں اور ہے تو اس نوعیت کی کتابیں جن میں مذاہب کا تعارف ہے کورس میں شامل نہیں۔ یہ سب اس مائنڈ سٹ کی غلطی ہے جو صدیوں سے چلی آ رہی ہے ،جس کا خمیازہ ہمیں آج بھگتنا پڑ رہا ہے۔ حیدرآباد میں بعض مخلصین لسان قوم میں دعوت توحید لے کر کھڑے ہونے والے علماء پیدا کرنے کے لئے انگلش میڈیم دارالعلوم بنانا چاہتے ہیں لیکن ابھی ''ہنوز روز اول'' کا معاملہ ہے ابھی تک بیچارے اس کے لئے ایک کیمپس بھی تیار نہیں کر سکے۔لوگ صرف روایتی انداز کے مدرسوں

کی مدد کرتے ہیں۔ آر ایس ایس نے ملک کے نوجوانوں کو اپنے قریب لانے کے لئے تعلیمی ادارے قائم کئے، ششومندر اور سرسوتی مندر قائم کئے۔ مسلمان انبیائی منہج پر علماء کو لانے کے لئے، لسان قوم میں قوم کو بلانے اور دعوت دینے کے لئے ایک بھی ادارہ قائم نہیں کر سکے۔ روایتی مدرسوں سے، دیوبند، مظاہر العلوم اور ندوہ وغیرہ سے ملک کے حالات مسلمانوں کے حق میں اسوقت تک تبدیل نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ حالات کے تقاضوں کے مطابق نصاب تعلیم تبدیل نہیں کرتے ہیں۔ کاش ان مدرسوں کو یہ احساس ہو جائے کہ اس وقت ایسے علماء کی ضرورت ہے جو لسان قوم میں قوم کو، برادران وطن کو خطاب کر سکیں، ان کی غلط فہمیوں کو دور کر سکیں اسلام کا جلوہ حق انگریزی اور ہندی اور دیگر زبانوں میں، لسان قوم میں قوم کے سامنے پیش کر سکیں۔

حالات کے اس جائزے کے بعد اور تاریخ کے تجزیہ کے بعد ہمیں بہت سنجیدگی کے ساتھ یہ سوچنا ہوگا کہ ہماری آئندہ منصوبہ بندی کیا ہو اور ہم اپنی غلطیوں کی تلافی کس طرح کریں۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، قاسم نانوتوی اور مولانا الیاس کی عظیم خدمات کا ہر شخص معترف ہے لیکن اس کے ساتھ میں جو بات جو حالات اور جو ضرورت آپ سے عرض کر رہا ہوں وہ بھی بالکل درست ہے۔ ہمیں اسلام کی گاڑی کو پھر سے اپنی پٹری پر لانا ہوگا۔ اور قرن اول کے شاکلہ ذہنی کو یعنی مائنڈ سیٹ کو دوبارہ برسر عمل اور تازہ کار بنانا ہوگا۔

پہلی صدی ہجری میں جزیرۃ العرب میں صحابہ کرامؓ اور غیر مسلموں کے درمیان رابطہ تھا اور تعلقات موجود تھے قرابت داری بھی تھی زبان کی کوئی خلیج بھی حائل نہیں تھی، لیکن ہندوستان میں یہاں صورت حال مختلف ہے، یہاں رابطہ ٹوٹ چکا ہے، زبان کی خلیج بھی کسی درجہ میں حائل ہے، یہاں دعوت سے پہلے دعوت کا پلیٹ فارم تیار کرنا ہوگا، رابطے استوار کرنے ہوں گے، اس ملک میں برادران وطن کے ساتھ Mass Contact قائم کرنا ہوگا۔ اور اس رابطے کو بتدریج توحید کے پیغام کی اشاعت کے لئے استعمال کرنا ہوگا۔ ایسا ماحول پیدا کرنا ہوگا کہ غیر مسلم یہ محسوس کریں کہ مسلمان ایک شریف پڑوسی ہوتا ہے، وہ سب کا ہمدرد اور خیر خواہ ہوتا ہے وہ اپنے اخلاق میں دوسروں سے بہتر ہوتا ہے۔ وہ محنتی اور ایماندار ہوتا ہے۔ وہ مستعد اور کارگذار ہوتا ہے، اس کو اپنی کمپنی، ادارے میں ملازمت دینا تجارت کی کامیابی کی ضمانت ہے اور پھر ان تمام اخلاقی خوبیوں کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو تعلیم کی طرف پوری توجہ دینی ہوگی اور مسلم معاشرے کے ہر فرد کو تعلیم یافتہ اور برسر کار بنانا ہوگا۔ غیر مسلم پڑوسیوں کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آنا ہوگا اور مناسب طریقے سے زبان سے یا لٹریچر کے ذریعے اپنے عمل و کردار کے ذریعے اسلام کی خوبیوں سے آگاہ کرنا ہوگا۔ یہ ہے وہ منصوبہ بندی جس پر بلا تاخیر عمل شروع ہونا چاہیے، ہماری بے حسی، بے عملی کے نتائج بہت خطرناک ہوں گے۔ یہ کام نہیں ہوا تو مسلمانوں کی تقدیر میں ہلاکت لکھی ہوئی ہے، اسپین میں جو کچھ ہوا اس سے سبق سیکھنے کی ضرورت ہے۔

یہ امت عقیدہ کی گمراہی پر جمع نہیں ہوئی ہے لیکن دعوت کی شاہراہ چھوڑنے پر ضرور جمع ہوئی ہے۔ انبیائی منہج سے گریز کی روایت ہماری تاریخ میں اتنی طویل ہوگئی ہے کہ ہماری ملت کے قائدین جب بھی اصلاح و دعوت کے

منصوبے بناتے ہیں تو ان کے سامنے غیر مسلم اور برادران وطن نہیں ہوتے ہیں۔ وہ اپنی دعوت کا ہدف صرف مسلمانوں کو بناتے ہیں اور مسجدوں میں مسلمانوں کے سامنے لسان المسلمین میں تقریر کرنے کے کام کو دعوت قرار دیتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی جیسی شخصیت نے ایسا کوئی منصوبہ نہیں پیش کیا اور مسلمانون کو برادران وطن کے درمیان کام کا کوئی مشورہ نہیں دیا، نہ انہوں نے اور نہ تبلیغی جماعت کے بانی مولانا الیاس دہلوی نے برادران وطن کے درمیان دعوت کے کام کا بیڑا اٹھایا۔لیکن ان دونوں اہم شخصیات پر جامع اور سب سے زیادہ مؤثر کتاب لکھنے والے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو شدت کے ساتھ ضرورت محسوس ہوئی کہ برادران وطن کو خطاب کیا جائے ،اس ضرورت کا احساس ہمارے پیشرو بزرگوں کو نہ ہوسکا، چنانچہ مولانا علی میاں نے اپنے خلوت خانہ تصوف سے اور قرطاس وقلم اور تصنیف وتألیف کے گوشۂ عافیت سے باہر نکل کر پورے ملک میں شہر بہ شہر پیام انسانیت کی تحریک شروع کردی۔ یہ وہ انقلابی کام تھا اور وہ صحیح منصوبہ تھا اور ایک طرح کا جہاد تھا جو نہ تو حضرت مولانا الیاس سے ہوسکا اور نہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے۔''اگر پدر نتواند پسر تمام کند''۔حضرت مولانا علی میاں خود ''لسان قوم'' ہندی اور دیگر زبانوں سے واقف نہ تھے،لیکن دنیا میں اولوالعزم دانشمند جب کرنے پر آتے ہیں، سمندر پاٹتے ہیں، کوہ سے دریا بہاتے ہیں، ان کے عزم وارادہ کے آگے ہر طاقت سرنگوں ہوجاتی ہے۔لسان قوم سے ناواقفیت کی کمی بڑی حد تک ان کے دست راست مولانا عبدالکریم پاریکھ نے پوری کی۔اس بارہ خاص میں یعنی غیر مسلموں سے رابطہ قائم کرنے کے سلسلہ میں مولانا علی میاں کو نہ صرف معاصر علماء پر بلکہ متقدمین پر بھی ایک گونہ فضیلت حاصل ہے۔علماء کے طبقے میں برادران وطن کے دلوں کے دروازے پر دستک دینے کی ضرورت کا شعور جو مولانا علی میاں کو حاصل تھا جماعتوں میں جماعت اسلامی کو ملا۔ جماعت اسلامی نے ہندی اور ملک کی دیگر زبانوں میں قرآن مجید کے ترجمے شائع کیے اور اردو کتابوں کے ہندی میں ترجمے کئے،لسان قوم میں اسلامی لٹریچر کی اشاعت ضروری ہے لیکن اس سے اہم کام قوم تک ،برادران وطن کے تعلیم یافتہ حلقوں تک ان کتابوں کو پہنچانا ہے۔ مولانا مودودی نے پاکستان جاتے ہوئے ہندوستان کی جماعت کو اس کام کی نصیحت کی تھی لیکن یہ ادراک بہت کم لوگوں کو ہوا کہ پاکستان کی تشکیل نے ہندوستان میں دعوت اسلام کے راستہ کو مسدود کیا ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کو اس سے بہت نقصان پہنچا ہے۔مولانا علی میاں صاحب کی پیام انسانیت کی تحریک براہِ راست دعوت اسلام کی تحریک نہیں تھی لیکن اسلام کی دعوت کے لیے پلیٹ فارم اس سے ضرور تیار ہورہا تھا۔اس سے رابطے استوار ہورہے تھے، غلط فہمیاں دور ہورہی تھیں، موجودہ حالات میں پیام انسانیت کی تحریک کو طاقتور اور زیادہ نفع بخش اور فیض رساں بنانے کی ضرورت ہے۔اس تحریک کے جلسے ہوں تو ان جلسوں میں تین چوتھائی تعداد غیر مسلموں کی ہونی چاہیے اور شہر کے تمام غیر مسلم لوگوں کو جلسے میں مدعو کرنا چاہیے۔ جلسے کے انعقاد سے پہلے اس کی پوری کی تیاری کرنی چاہیے۔ حالات کی سنگینی کو خوش گوار حالات سے بدلنے کی ایک اہم ترکیب یہ بھی ہے کہ پیام انسانیت کی تحریک کو زیادہ مؤثر بنایا جائے، یہ تحریک صرف جلسوں اور کانفرنسوں کی تحریک نہ ہو بلکہ برادران وطن سے لسان قوم کے ذریعہ مؤثر رابطہ کا ذریعہ ہو۔مسلمانوں اور غیر مسلموں کے

درمیان تعلقات اور خیر سگالی کی تحریک کی پہچان ہو۔یعنی جلسوں کے باہر بھی اور اس کے بعد بھی برادران وطن سے تعلقات قائم کرنے کا وسیلہ اور ذریعہ ہو۔تبلیغی جماعت اور خانقاہیں مسلمانوں کے تزکیہ نفس اور اصلاح اخلاق، مردم سازی اور آدم گری کے میدان میں کام کررہی ہیں یہ کام مفید ہے اور پیغمبرانہ کاموں میں سے ایک کام ہے، لیکن پیغمبروں کے نزدیک انسانوں کے سواد اعظم کو دوزخ کی آگ سے بچانا بھی ضروری کام ہے اور کوئی رسول پیغمبر ایسا نہیں ہے جس نے یہ کام انجام نہ دیا ہو اور یہ کام غیر مسلموں سے، برادران وطن سے تعلقات قائم کئے بغیر انجام نہیں پاسکتا ہے۔اپنی بے علمی اور بے عملی کے اعتراف کے باوجود ایسا لگتا ہے کہ بہت سے ذکی اور اہل علم اس نکتہ تک نہیں پہنچ سکے۔ان کے سامنے کام کا واضح نصب العین نہیں ہے۔اس وقت مسلم تنظیموں اور اداروں اور مدارس کے ذمہ داروں کو اور اہل علم کو اور اہل وجاہت کو اپنے گرد وپیش رہنے والے برادران وطن سے رابطہ استوار کرنا چاہئے۔ان کو اپنے دینی پروگراموں میں آنے کی دعوت دینی چاہیے۔اور حضور اکرم ﷺ نے جس طرح اہل قریش کی دعوت کی تھی اسی طرح برادران وطن کے لئے دعوت کا اہتمام کرنا چاہئے اور ان کے دلوں کو جیتنے کی کوشش کرنی چاہئے۔میں کوئی فقیہ نہیں، فیصلہ کا حق تو فقہ اکیڈمی اور فقہاے کرام کو ہے، میری ذاتی رائے ہے کہ زکاۃ کی مؤلفۃ القلوب کی مد کو بھی اسلام کی اشاعت کے لئے کھولنے کی ضرورت ہے۔

اب تک گفتگو میں جتنی باتیں آپ کے سامنے کی گئی ہیں ان کا تعلق خارجی محاذ سے ہے لیکن'' حالات حاضرہ اور مسائل اور ان کا حل'' سے متعلق گفتگو نامکمل ہوگی اگر داخلی محاذ کا تذکرہ نہ کیا جائے اور مسلمانوں کا داخلی محاذ ہے باہمی اتحاد، ایمان و اخلاق کی مضبوطی اور تعلیم و ہنر کے حصول کی طرف التفات۔ضروری ہے کہ ہماری ملت کا کوئی شخص بھی بے علم و بے ہنر باقی نہ رہے۔اس محاذ پر پوری جدوجہد کرنے اور اپنا سرمایہ لگانے کی ضرورت ہے۔بہت سے ادارے اس محاذ پر کام کر رہے ہیں جیسے الامین سوسائٹی، شاہین گروپ آف کالجز اور رحمانی ۳۰ وغیرہ، ان اداروں کی قدردانی کی ضرورت ہے۔ ہر مسلمان کو چاہئے کہ سادہ زندگی گزارے۔شادی بیاہ میں اسراف کرنے کے بجائے اپنے ہر بچے کو اور افراد خاندان کو تعلیم یافتہ بنائے، ہر بچہ اسکول جائے، ہر شخص کسی نہ کسی ہنر میں ماہر ہو، خوش اخلاق ہو مہذب اور باشعور ہو۔ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے داخلی محاذ کے ساتھ اس خارجی پر بھی کام کریں جس کا تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا جاچکا ہے اور یہ کام اتنا ضروری ہے کہ اگر یہ نہ ہوسکا اور غیر مسلموں سے Mass contact اس ملک میں نہیں ہوا اور ان سے رابطہ استوار نہیں ہوا اور ان کی غلط فہمیاں دور نہیں کی گئیں اور اسلام کا پیغام زبان وعمل سے نہیں پہونچایا گیا تو مسلمانوں کے جتنے ادارے ہیں مسلم پرسنل لا بورڈ اور دیگر تمام تنظیمیں ان کی تقدیر میں ناکامی لکھی ہوئی ہے۔اللہ تعالی کی نصرت اسی صورت میں نازل ہوگی جب اللہ کی نصرت کی جائے گی۔یہی مفہوم ہے اس آیت کا۔**ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم** .

اللہ تعالی ہم سب کو بات سمجھنے اور صحیح راہ پر چلنے کی توفیق ارزانی فرمائے۔

☆☆☆

❑ مطالعۂ سیرت

پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم اور معاشرتی وقانونی مساوات

محمد قمر الزماں ندوی
مدرسہ نور الاسلام، کنڈہ پرتاپگڑھ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کردار کے ان گنت پہلو ہیں، جن کا شمار کرانا تقریباً ناممکن ہے۔ کسی انسان کا عظیم ہونا اس کی عظمت کردار سے ہی عبارت ہوتا ہے۔ کردار کی عظمت ہی وہ کسوٹی ہے جو کسی انسان کو عظیم بناتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کی گواہی اور شہادت خود قرآن نے ان الفاظ میں دی: **انک لعلی خلق عظیم** بیشک آپ اخلاق کے بلندترین مقام پر فائز ہیں۔

مسلمانوں کو آپ کی عظمت میں کیا شک ہوسکتا ہے۔ غیر مسلموں نے بھی آپ کی عظمت کا اقرار کیا ہے۔ کیوں کہ تاریخ نے یہ ثابت کیا اور یہ گواہی دی کہ آپ نے ایک ایسی قوم میں ایک ہمہ گیر انقلاب برپا کر کے دکھلایا جو ہر طرح کے فتنہ وفساد میں ڈوبے ہوئے تھے، سنگ دلی اور قتل وغارت گری میں جو سفاک درندے بن چکے تھے۔

آپ کی عظمت کردار کے پہلو میں دیانت، عدالت، صداقت، انسانی ہمدردی، غمگساری وہمدردی، صبر وثبات عفوودر گزر اور اس کی تلقین، معاشرتی مساوات، قانونی مساوات شامل ہیں۔ ہم یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی برپا کردہ معاشرتی اور قانونی مساوات پر مختصراً گفتگو کریں گے۔

معاشرتی مساوات و برابری کا مطلب یہ ہے کہ ایک انسان اپنے آپ کو معاشرہ کا ایک فرد سمجھے، لوگوں میں گھل مل کر رہے۔ ان کے دکھ درد خوشی وغمی میں شریک رہے ہر ایک کی ضرورت کے وقت شریعت کے حدود میں رہتے ہوئے کام آئے، اس کی مدد ونصرت میں آگے آگے رہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو جب ہم اس حیثیت سے اور اس ناحیے سے پڑھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ کسی مجلس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کسی بلند جگہ پر بیٹھے ہوں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نیچے بیٹھے ہوں۔ جیسا کہ آج کل کے مصنوعی پیر ومرشد اور سجادہ نشینوں کا طرز اور دستور ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مل کر اور بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے حتی کہ غلاموں کو بھی اپنے ساتھ اور اپنے قریب بٹھاتے تھے۔

معاشرتی اور سماجی مساوات کا ایک اور پہلو تنگی ترشی میں برابر کی شرکت ہے۔ اس پہلو سے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ سب سے نمایاں اور ممتاز ہے۔ شعب ابی

طالب میں مسلمان اوران کے ساتھی معاشرتی بائیکاٹ کی وجہ سے تین سال تک محصور رہے۔ اس دوران اکثر فاقہ کشی کی نوبت آتی رہی۔ مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ دوسروں کو چھوڑ کر آپ کو کھانا مہیا کیا جاتا ہو یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو گوارا فرمایا ہو۔

جنگ احزاب کے دوران خندق کی کھدائی کا کام شروع ہوا، معاشی لحاظ سے یہ انتہائی تنگی اور عسرت کا وقت تھا۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پیٹ پر پتھر باندھ کر بھی کھدائی کا کام جاری رکھتے۔ اس دوران صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مشاہدہ کیا کہ آپ کے پیٹ پر تو دو دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔

غزوات اور جنگوں میں عموماً سواری کم میسر آتی تھی اور غزوۂ ذات الرقاع میں تو چھ آدمیوں پر ایک سواری آئی تھی۔ ایسے موقع پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے الگ سے سواری کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی دوسرے صحابہ کی طرح باری باری سے سوار ہوتے اور صحابہ کرام کے اصرار کے باوجود اپنی باری کے علاوہ سوار ہونا گوارا نہ فرماتے تھے۔

معاشرتی اور سماجی مساوات کا تیسرا پہلو کام کاج میں برابر کی شرکت ہے۔ مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کی تعمیر جب شروع ہوئی تو جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اینٹ پتھر گارا اٹھا کر لا رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی لا رہے تھے اور ہر کام میں برابر کے شریک تھے۔ جنگ احزاب کے دوران خندق کی کھدائی کا کام شروع ہوا تو کھدائی میں جتنا حصہ ایک صحابی کے ذمہ تھا اتنا ہی حصہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذمہ بھی لگایا تھا۔

ایک دفعہ دوران سفر اسلامی فوج نے کسی مقام پر پڑاؤ ڈالا اور کھانے پکانے کے کام کو آپ نے صحابہ کرام کے درمیان تقسیم فرما دیا۔ بعد میں کچھ دیر کے لیے آپ غائب ہو گئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کے غائب ہونے پر کچھ پریشان سے ہوئے تھوڑی دیر بعد صحابہ کرام نے دیکھا کہ آپ جنگل سے ایندھن کی لکڑی اکٹھا کر کے لا رہے ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ یہ کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے ذمہ لیا تھا۔

یہ وہ عادات واطوار ہیں جو سماجی اور معاشرتی اعتبار سے کسی کے کردار کی عظمت کا زندہ ثبوت ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کردار کا ایک پہلو عدل و انصاف اور قانونی مساوات سے دنیائے انسانیت کو روشناس کرانا ہے۔ آپ صلی الہ علیہ وسلم نے ایک ایسے سماج اور سوسائٹی کو جو ظلم وستم اور جبر وتشدد کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی جہاں انسانیت کراہ اور سسک رہی تھی، ہر طاقت ور اپنے سے کمزور پر ظلم کو روا سمجھتا تھا، جہاں طوائف الملوک کا دور دورہ تھا، جہاں قانون اور انصاف نام کی کوئی چیز نہ تھی، جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا ماحول تھا، ایسے ماحول میں آپ نے عدل پروری اور مساوات کا بگل بجایا اور قانون کی حکمرانی و بالادستی اور قانون کا سکہ رائج کیا اور کسی کو قانون سے بالاتر ہونے کی اجازت نہیں دی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے کو بھی یہی کہہ کر عوام کی عدالت میں پیش کیا کہ جس کسی کو مجھ سے کوئی بدلہ یا قصاص لینا ہو وہ آج لے سکتا ہے۔ اس اعلان پر ایک صحابی نے ایسا مطالبہ کر دیا جس میں حب نبوی

اور عشق رسول کی سچی تصویر نکھر کر سامنے آتی ہے اور اپ کا وصف عدالت بھی نکھر کر سامنے آتا ہے، جس کی تفصیلات ہم یہاں بخوف طوالت بیان کرنے سے قاصر ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آپ کو دوسروں سے بالاتر اور قانون کی گرفت سے آزاد نہیں سمجھتے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاندان رشتہ دار اور قریبی لوگوں کے ساتھ بھی قانونی مساوات کو جاری رکھا اور کسی کے ساتھ کوئی ادنی رعایت نہیں کی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبیلہ قریش کی ایک ذیلی شاخ بنومخزوم کی عورت فاطمہ مخزومی نے چوری کی تو آپ کے قبیلہ والوں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ اگر اس قریشی عورت کے ہاتھ کاٹے گئے تو عرب بھر میں قبیلہ والوں کی ناک کٹ جائے گی۔ لہٰذا انھوں نے اس سزا سے درگزر یا تبدیلی کے لیے سفارش کی راہیں ہموار کرنا شروع کیں۔ بالآخر بہت غور و خوض کے بعد حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو جو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں بہت محبوب تھے جن کو آپ اپنے نواسے اور اولاد کی طرح مانتے تھے ان لوگوں نے سفارش کے لئے ان کو کسی طرح تیار کیا۔ جب حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں سفارش کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ سرخ و متغیر ہوگیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بسر منبر ارشاد فرمایا:

اسامہ! تم اللہ کی حدود کے سلسلہ میں سفارشی بن کر آئے ہو؟ تم سے پہلی امتوں کی ہلاکت کا سبب ہی یہ تھا کہ جب ان میں سے کوئی کمزور جرم کرتا تو اسے سزا دیتے اور اگر کوئی مالدار بڑا اور طاقتور آدمی جرم کرتا تو اس کی سزا موقوف کردی جاتی۔ اللہ کی قسم! اگر فاطمہ مخزومی کی بجائے فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹنے کا حکم دیتا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس بے لاگ فیصلہ کا اور قانونی مساوات برپا کرنے کا نتیجہ اور اثر یہ ہوا کہ جو عرب قانون کی حکمرانی اور بالادستی اور عدل و انصاف سے کوسوں دور تھے وہاں عدل وانصاف کا سکہ رائج ہوگیا اور قانونی مساوات سے کوئی اپنے کو الگ نہیں سمجھنے لگا۔

آج بھی اگر حکومتیں ادارے اور جماعتیں اس معاشرتی اور قانونی مساوات کو نافذ کرلیں تو دنیا جنت نشان بن جائے ہر طرح کا انتشار بدامنی اور ظلم و برائی کا خاتمہ ہوجائے اور پھر کسی کو کسی سے نفرت اور شکوہ و شکایت کا موقع نہ مل سکے۔ لیکن بدقسمتی کی بات ہے کہ حکومتوں اور اداروں میں کہیں بھی یہ معاشرتی و قانونی برابری دیکھنے کو نہیں ملتی۔ قانون اور کتابوں میں اگرچہ یہ سب کچھ بڑے سنہرے الفاظ میں لکھا ہوا ہے، مگر عملی میدان میں دیکھو تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے لیے یہی کافی ہے کہ آپ نے اس مساوات کو نہ صرف بیان کیا بلکہ عملاً برت کر دکھایا۔

دنیا کو چاہیے کہ آپ علیہ السلام کے عملی نمونے کی پیروی کرے، اسی میں اس کی بھلائی ہے۔

☆☆☆

❑ تعلیم و تربیت

تربیت اولاد- چند اہم گوشے

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

حوصلہ افزائی:

عادل جس کی عمر ۱۲؍سال ہے اور اس کا بھائی عبداللہ جس کی عمر ۱۴؍سال ہے، دونوں نے سال کے آخر میں رزلٹ پایا، عادل فخر کے جذبہ سے لبریز بھاگا ہوا ماں کے پاس آیا تاکہ اس کو اپنا ممتاز نتیجہ دکھا سکے۔

ماں: بہت اچھا رزلٹ ہے میرے پیارے، دیکھو تو ریاضی میں ۹۲ نمبر ہیں، زبردست، بہت خوب، آج شام جب تمہارے ابو آئیں گے تو بہت خوش ہوں گے اور تم پر فخر کریں گے، لیکن بیٹا عبداللہ کا کیا ہوا؟ وہ کہاں ہے؟

عادل: اماں آپ تو جانتی ہیں کہ وہ توجہ نہیں دیتا، پڑھائی میں دلچسپی نہیں لیتا، میں نے دیکھا کہ اس نے غصہ میں اپنا رزلٹ زمین پر پھینک دیا ہے۔

ماں: (پریشان ہوکر) کہاں ہو عبداللہ، فوراً یہاں آؤ اور اپنا رزلٹ بھی ساتھ لاؤ۔

عبداللہ: (ماں کو رزلٹ دیتے ہوئے) یہ آپ کو کبھی پسند نہیں آئے گا۔

ماں: (رزلٹ دیکھتے ہوئے) ہاں یہ تو مجھے واقعی کبھی نہیں پسند آئے گا، اوفوہ! یہ کیا ہے؟ سائنس کا رزلٹ دیکھو، یہ تو واقعی شرمناک معاملہ ہے، تم کبھی محنت نہیں کرتے، آخر تم عادل کی طرح محنت کیوں نہیں کرتے کہ ہم سب کو اس طرح رسوا نہ کرتے! مجھے نہیں معلوم کہ مستقبل میں تم کیا کرو گے؟

عبداللہ اسی ڈپریشن اور پریشان کن حالت میں تھا، اس کی ماں مزید اس کو اپنی باتوں سے کچوکے لگا رہی تھی اور نفسیاتی طور پر اسے ڈپریس کر رہی تھی، ایسا لگتا ہے کہ ماں کو اس سے بہت زیادہ کچھ کرنے کی امید نہیں تھی، چنانچہ وہ مسلسل اس کو نقد کا نشانہ بنائے جا رہی تھی اور اس کا تقابل اس کے چھوٹے بھائی سے کیے جا رہی تھی، ماں کا یہ طریقہ اور یہ گفتگو پورے طور پر مایوسی کو جنم دینے والی، عزم و ہمت کو چور چور کر دینے والی تھی، اہم بات یہ ہے کہ اس موقع پر ماں اس نکتہ سے غافل ہے کہ وہ اپنے اس طرز عمل اور انداز گفتگو سے خود ہی دوسرے بیٹے عادل کی ہمت شکنی اور مایوسی کا سامان بھی فراہم کر رہی ہے، اس لیے کہ بہت زیادہ تعریف یا تعریف میں مبالغہ آرائی (جس پر ہم اس فصل میں گفتگو کریں گے) بچوں کی خود اعتمادی کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے، اپنے آپ پر اعتماد کرنے کے سلسلہ میں ان کی مایوسی میں اضافہ کا باعث ہوتی ہے، خود فیصلہ لینے کی قدرت کو کمزور کرتی ہے، اس کے نتیجہ میں پھر وہ اپنے بارے میں گھر والوں کی رائے پر زیادہ اعتماد کرنے لگتے ہیں۔

ماں باپ کس طرح اپنی اولاد کی ہمت شکنی کرتے ہیں؟

بہت سے گھرانوں میں اولاد کی اچھی تربیت کے لیے بڑی کوشش کی جاتی ہیں، اس کے لیے خاص طور پر ان کی غلطیوں پر نظر رکھی جاتی ہے۔ نتیجتاً خوب ڈانٹ ڈپٹ ہوتی ہے، بچوں کو ملامت کی جاتی ہے، سزا دی جاتی ہے، شرمندہ کیا جاتا ہے اور بات بات پر تنقید کی جاتی ہے، گویا ماں باپ بچوں کی غلطیاں اور ان کے عیوب سے واقف ہونے کے لیے

جاسوس بن جاتے ہیں، یہ رویّہ دراصل بچوں کی ہمت شکنی میں بڑا کردار ادا کرتا ہے اور انھیں احساس کمتری میں مبتلا کر دیتا ہے۔

اسی طرح بچوں سے اگر فیصلہ اور انتخاب کا حق لے لیا جائے تو اس سے بھی ان کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے، اس طرح والدین اولاد کو یہ احساس دلاتے ہیں کہ وہ کمزور ہے اور اپنے متعلق فیصلے لینے سے عاجز ہے۔

اسی طرح بعض دوسرے بھی رویّے ہیں جن سے بچوں کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے اور ان کے اندر احساس کمزوری پیدا ہوتا ہے۔

ذرا سوچیے کہیں بچوں سے ہماری توقعات ان کی صلاحیت اور ان کے امکانات سے زیادہ تو نہیں؟ مثلاً ہم ان سے ایسی امید تو نہیں رکھتے کہ ہر وقت ان کا کمرہ مرتب رہے، ان کی گھریلو ضروریات اور اسکول کے کام سب بالکل مکمل ہوں؟ یا پھر ان سے ہماری توقعات ان کے امکانات اور ان کی عمر کے بقدر ہیں؟ یہ اچھی اور مفید بات ہے کہ دوسروں سے ہم اچھی توقعات رکھیں، لیکن یہی توقعات اگر حد سے بڑھ جائیں اور ان میں مبالغہ ہو تو پھر یہی ہمت و حوصلہ افزائی کے بجائے ہمت شکنی کا سبب بنتی ہیں۔

کیا ہم کسی ایسے بچے کے سامنے جو کامیابی میں سست رفتار ہے کسی ایسے بچے کی بہت زیادہ تعریف و توصیف کرتے ہیں جو بہت تیزی سے کامیابی کا سفر طے کر رہا ہے؟

یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ جس وقت ہم دونوں بچوں کے درمیان تقابل کر رہے ہوتے ہیں، اس وقت انھیں باہمی مقابلہ آرائی اور تنازع کی طرف لے جا رہے ہوتے ہیں یا پھر انھیں اشتراک عمل اور باہمی تعاون پر آمادہ کر رہے ہوتے ہیں، یہ بات خاص طور پر یاد رکھنا چاہیے کہ تنافس یعنی باہمی مقابلہ آرائی بالعموم کمزور کی مزید ہمت شکنی کا سبب بنتی ہے۔

کیا ہمارے پاس دوہرا معیار ہے، ایک معیار اور ایک ترازو سے ہم اپنے کو تولتے اور پرکھتے ہیں اور دوسرے سے اپنے بچوں کو؟ مثلاً کیا ہم بچوں سے ان کے بیڈروم کی جس قدر نظم و ترتیب کے خواہاں ہیں اسی قدر خود اپنے بیڈروم کو مرتب رکھتے ہیں؟ بچوں کی بات کاٹنے میں ہم آزاد ہوتے ہیں بلکہ اپنے آپ کو ایسا کرنے میں حق بجانب سمجھتے ہیں، حالانکہ بچوں سے ہم باصرار مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ہماری بات نہ کاٹیں، ظاہر ہے کہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم بچوں کو کمتر سمجھتے ہیں، اس احساس کے ساتھ بچوں سے معاملہ کرنا بھی ہمت شکنی کا سبب بنتا ہے۔

اچھے اور مثبت رویے پر توجہ:

ہمارے معاشرے کی افسوسناک عام صورت حال یہ ہے کہ حوصلہ افزائی کے کاموں پر حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی، دوسروں کے ساتھ تعامل سے ہم یہ سب نہیں سیکھتے، بلکہ بتدریج اپنی کوششوں اور اپنے اعمال کے نتائج دیکھ کر اور دوسروں کی حوصلہ افزائی کے اچھے اثرات دیکھ کر اپنی ذات پر ہمیں بھروسہ ہوتا ہے، اگر آپ یوں کہیں ''تم نے ۲۰ میں سے ۱۰ نمبر حاصل کیے، صحیح ہے'' یہ اس طرح کہنے سے بدرجہا بہتر ہے کہ ''تم نے ۲۰ میں سے ۱۰ نمبر حاصل کیا، یہ غلط ہے'' جبکہ دونوں جملوں کے بعد بھی نتیجہ ایک ہی ہے، کیوں کہ پہلا طرز کلام مثبت رویّہ کو پروان چڑھانے میں معاون ہوگا اور دوسرے سے منفی رویہ کی تائید ہوگی جبکہ مثبت رویہ مزید آگے بڑھنے اور مزید محنت کرنے پر ابھارے گا، حقیقت یہ ہے کہ مثبت رویہ والدین کے اندر روزانہ کی مشق و کوشش سے ہی پروان چڑھ سکتا ہے۔

ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ بسا اوقات بچے کے برتاؤ پر تنبیہ و تصحیح کی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً اگر ہم کسی وقت بچے کا کوئی ایسا برتاؤ دیکھیں جو کسی شدید مشکل کا پیش خیمہ بن سکتا ہو اور جس سے اغماض ممکن نہ ہو تو ہم کیا کریں؟ سب سے پہلے ضروری ہے کہ ہم فعل اور فاعل کو الگ کر دیں، عمل کی تصحیح کریں

مگر عمل کرنے والے کی تنقید نہ کریں، مثلاً بچی سے دودھ زمین پر گر گیا تو ہونا یہ چاہیے کہ بچی سے اسے صاف کرنے کا مطالبہ کیا جائے نہ کہ اس کو احمق بے وقوف اور مغفل کہا جائے، ذرا بڑا بچہ اگر شیر خوار کو دھمک دے تو بجائے اس کے کہ اس کو برا بھلا کہا جائے، اس کو بتایا جائے کہ شیر خوار بچے کو مارنا اچھا عمل نہیں ہے۔

بہتر یہ ہے کہ جب بھی ممکن ہو غلط رویّے سے چشم پوشی برتی جائے اور صحیح رویّے پر توجہ مرکوز رکھی جائے، مثلاً جب تک بچوں کا آپسی جھگڑا بہت زیادہ نہ بڑھ جائے یا بڑھ جانے کا خطرہ نہ ہو تب تک اہل خانہ کو اغماض برتنا چاہیے، کیوں کہ عام طور پر بچے ایسا ہماری توجہ مبذول کرانے کے لیے کرتے ہیں، اسی طرح بچے آپس میں ایک دوسرے کو قصے کہانی سناتے ہیں اس سے بھی اغماض ہی بہتر ہے، اگر بچے یہ سمجھ جائیں گے کہ آپ ان قصے کہانیوں کو نہیں سنتے اور نہ ہی اس کی تحقیق کرتے ہیں تو زندگی زیادہ پرسکون ہو جائے گی، ہمیشہ یہ بات ملحوظ رکھنا چاہیے کہ والدین اچھے اور مثبت عمل پر توجہ مرکوز رکھیں، مثلاً بچہ اگر کسی کام کو انجام دینے کی کوشش کرے تو والدین توجہ دیں، اسی طرح بچے اگر ایک دوسرے کا تعاون کریں، آگے بڑھنے کے لیے اچھے اقدامات کریں، اپنی صلاحیتوں کا اظہار کریں تو والدین کو اس پر توجہ دینا چاہیے۔

مثلاً ایک بچی کچن کے برتن اچھی طرح نہیں دھو پاتی مگر دسترخوان اچھی طرح صاف کرتی ہے تو والدین کو صرف اس کی اس کوشش کو سراہنا چاہیے جو اس نے کی، وہ حوصلہ افزائی زیادہ مفید ہوتی ہے جو عام طور پر خلوص دل سے ہوتی ہے، جس میں اخلاص کے ساتھ کوشش کو سراہا جاتا ہے اور شکر کا اظہار ہوتا ہے، بہت سے لوگوں کو اس کا بھی بڑا فائدہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ پر، اپنے اور دوسروں کے اچھے اعمال پر غور وفکر کے لیے دن کا کوئی وقت خاص کرتے ہیں، اس سے ان کو دوسروں کی کوششوں کا جائزہ لینے میں مدد ملتی ہے، اور پھر ان کے لیے جذبۂ شکر پیدا ہوتا ہے اور ان کے لیے حوصلہ افزائی میں بھی تاثیر پیدا ہوتی ہے۔

مبالغہ آمیز تعریف اور حوصلہ افزائی میں فرق:

مبالغہ آمیز تعریف اور حوصلہ افزائی میں تھوڑا سا فرق ہوتا ہے، حالانکہ بسا اوقات لوگ دونوں کو یکساں سمجھنے کی غلطی کرتے ہیں، مبالغہ آمیز تعریف میں یہ بھی شامل ہوتا ہے کہ بچے کے عمل پر اہل خانہ کیا حکم لگاتے ہیں، اس سے بچے کے اندر خود اعتمادی کی صفت نہیں پیدا ہوتی، ہاں کبھی کبھی بہت زیادہ تعریف مفید ہوتی ہے، لیکن اس کے منفی اثرات سے ہمارا آگاہ رہنا بہر حال مفید ہے، اس لیے کہ مبالغہ آمیز تعریف عام طور پر ہمت شکنی کا سبب بنتی ہے، کیونکہ بہت زیادہ تعریف صرف اس بچے کی کی جاتی ہے جو بہت کامیاب اور ممتاز ہوتا ہے، یہ تعریف اس کے اس نتیجہ کے سبب ہوتی ہے جو اس نے حاصل کیا نہ کہ اس کی اس کوشش کی جو اس نے کی، اس مبالغہ آمیز تعریف میں بچے کا دوسروں سے تقابل بھی کیا جاتا ہے، جس سے وہ ہمیشہ دوسروں کی توجہ حاصل کرنے اور ان کی نظر میں مقبول بننے کے لیے پریشان رہتا ہے، یہ چیز خود اس کی خود اعتمادی کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے، بہت زیادہ تعریف و ستائش کو غیر مخلصانہ عمل اور تملق کی ایک قسم بھی شمار کیا جاتا ہے۔

مبالغہ آمیز ستائش کی مثالیں یہ ہیں:

مثلاً اہل خانہ بچے سے کہیں ''تم بہت بڑے آدمی ہو''، بچی سے کہیں کہ ''تم بہت اچھی ہو''، ''تم تو ہمیشہ کامیاب ہوتے ہو، کبھی کوتاہی نہیں کرتے''، ان تینوں ہی جملوں میں اہل خانہ نے خود ہی حکم صادر کر دیا اور فیصلہ کر دیا، ہونا یہ چاہیے تھا کہ حوصلہ افزائی کے کلمات کہتے اور بچے کو اپنے عمل کے متعلق خود فیصلہ کرنے کے لیے چھوڑ دیتے اگر بچہ واقعی کوئی بہت بڑی کامیابی حاصل کرے تو اس طرح کے جملے کہنے میں حرج بھی

نہیں، لیکن بہر حال ہم کو یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ کسی حال میں بھی ہم مبالغہ نہ کریں، نہ بہت زیادہ تعریف کریں اور نہ دوسروں سے تقابل، ہمارے جملوں کا کیا فائدہ ہوگا اور کس قدر ہوگا؟ اس کا اندازہ کرنے کے لیے بہتر ہے کہ ہم خود سے سوال کریں کہ: ''کیا ہماری گفتگو بچے کی خود اعتمادی میں مزید اضافہ کرے گی؟'' واقعہ یہ ہے کہ مبالغہ آمیز تعریف وستائش سے یہ مثبت اثرات نہیں پیدا ہوتے، یہاں ہم مبالغہ آمیز تعریف سے دور حوصلہ افزائی کے کچھ نمونے پیش کرتے ہیں۔

۱-خود ساختہ جملوں کا استعمال:

مثلاً یہ کہنے کے بجائے کہ ''تم نے بہت خوب کیا''، ''تم تو فلاں سے بہتر ہو'' یہ کہا جائے کہ ''میں تم سے یہی چاہتا ہوں''، ''مجھے تمہارے بارے میں اس سے زیادہ کا اندازہ تھا''، بچے عام طور پر اپنے اعمال پر ہمارے صحیح ردعمل اور قلبی احساسات کی کیفیت کا اندازہ کرنے پر قادر ہوتے ہیں، اس کے برخلاف جب ہم صرف حکم لگاتے ہیں تو بچے اس سے موافقت نہیں کر پاتے اور وہ حرج محسوس کرتے ہیں، کیونکہ ان کو اس حکم کے معیار تک نہ پہنچ پانے کا خوف ہوتا ہے۔

۲-بچے کی صلاحیتوں پر اپنے اعتماد کا اظہار کیجئے:

''مجھے بہت اچھا لگا کل جب تم نے گارڈن کی صفائی کی، واقعی وہ بہت گندا ہو رہا تھا''، یہ عبارت اس سے افضل ہے کہ آپ یوں کہیں: ''تم بہت اچھے بچے ہو اپنی عمر سے بڑے کام کرتے ہو''، یا یہ کہ ''تم نے رنگین تصاویر بنائی ہیں وہ بہت ممتاز ہیں''، بالفاظ دیگر آپ صرف بچے کی کوشش اور اس کے آگے بڑھنے (Acheavement) پر اپنی خوشی کا اظہار کیجئے، اس کی صلاحیتوں پر حکم لگانے کا کام خود اس پر چھوڑ دیجئے، یہ بھی مفید ہے کہ کبھی اہل خانہ بچے سے یہ سوال کریں، ''تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟'' پھر بچے کو چھوڑ دیجئے کہ وہ اپنی صلاحیتوں پر جس قدر یقین رکھتا ہو اسی طرح کا انتخاب کرے اور جواب دے۔

۳- کام میں جو مشکل پیش آئے اس کی طرف اشارہ کر دیجئے:

''تمہارے دھونے سے پہلے واقعی گاڑی بہت گندی تھی''، یہ کہنا بہتر ہے بجائے اس کے کہ آپ یوں کہیں ''تم بہت طاقتور ہو تم نے تو اس قدر گندی گاڑی بھی صاف کر ڈالا''، بچے کو چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ خود نتیجہ اخذ کرے اور خود تصویر مکمل کرے۔

۴-بہتری اور کوشش پر توجہ دیجئے:

''گذشتہ ایک ماہ میں تم صرف پانچ صفحہ پڑھ سکے''، ''پچھلا ایک گھنٹہ تم نے صرف اس ایک کام میں گذار دیا''، ''ہم نے دیکھا کہ گذشتہ دنوں تمہارے تعلقات اپنے چھوٹے بھائی سے زیادہ بہتر ہوئے ہیں'' سخت افسوس کی بات ہے کہ ہم ایک ایسی دنیا میں جیتے ہیں جہاں کوششوں سے زیادہ نتائج پر توجہ دی جاتی ہے، اسی لیے بچے کی کوششوں کو سراہا نہیں جاتا، اس پر اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی جس سے اس کی ہمت ٹوٹتی ہے، اس کوتاہی کے باوجود اس سے بڑی غلطی کرنے سے ہمیشہ بچنا چاہیے کہ بچے سے یوں کہا جائے ''اس میں کوئی شک نہیں کہ تم اس سے زیادہ کر سکتے ہو''۔

۵- دوسروں کی کوشش پر توجہ دیجئے اور دوسروں کی خدمت کیجئے:

اہل خانہ کو باہمی تعاون، باہمی شراکت اور آپس میں مقابلہ آرائی کی عادت ڈالنا چاہیے، پھر اگر دوسروں کی فکر وتوجہ سے کوئی کام ہو یا دوسرے دست تعاون بڑھائیں تو اہل خانہ کو ان کے لیے شکریہ کے کلمات بولنا چاہیے، مثلاً یوں کہیں: ''آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے اس عمل میں ہماری مدد کی''، ''میں اس کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں جو میں آپ کے بھائی زید کے سبب انجام دے سکا''، یہ عبارتیں اس طرح کی عبارتوں سے بہتر ہیں جیسے کہ یہ کہا جائے ''آپ تو ہمیشہ ہی

دوسروں کی مدد کرتے رہتے ہیں''۔

۶- بچے نے جو کام کیا اس کے آثار کو نمایاں کیجئے:

مثلاً یوں کہیے کہ ''اب کمرہ کس قدر صاف اور خوبصورت دکھائی دے رہا ہے''، ''تمہاری معاونت نے ہمارے کام کو کس قدر آسان بنا دیا'' یہ اور اس طرح کے جملے بچے کی حوصلہ افزائی کے لیے بہت مؤثر ہوں گے کیونکہ دراصل یہ مبنی پر حقیقت ہوں گے۔

خلاصہ:

خلاصہ کلام یہ ہے کہ بچہ جس قدر بھی کوشش کرے، اس کی کوشش کو سراہنا چاہیے، اس کے کام کے آثار و اثرات کا تذکرہ کرنا چاہیے، دوسروں پر اس کے توجہ دینے کا ذکر کرنا چاہیے، دوران عمل جن مشکلات کا اس نے سامنا کیا ان کو نمایاں کرنا چاہیے لیکن اس کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ والدین کا ردعمل صرف امانت وصداقت اور حقیقت پر مبنی ہو، کوشش یہ کرنا چاہیے کہ بچہ خود ہی اپنے ذریعہ انجام دیے گئے اچھے کاموں کا احساس کرنے لگے، یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اچھے کاموں کی تعداد ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ ہم ان کو بہت زیادہ محسوس نہیں کرتے، لیکن اگر بچے کے اچھے کاموں کو محسوس کیا جائے اور ان کا ذکر کیا جائے، تو یہ عمل بچے کی نشو ونما اور اس کے اعتماد کی تشکیل میں بہت اہم عنصر ثابت ہوگا۔

مندرجہ ذیل جملوں کو دیکھئے اور ان کے منفی نتائج پر غور کیجئے:

ہمت شکنی:

— تم فلاں کی طرح کیوں نہیں ہو؟

— ارے تم کو تو شیطان نے دھوکہ میں ڈال رکھا ہے۔

— ذرا اپنے گندے کمرے کو دیکھو — اوفوہ! تمہاری یہ گندگی۔

— ایسا نہ کرو، مت کرو، مت کرو۔

— تم بہت پریشان کن لڑکی ہو۔

مبالغہ آمیز تعریف:

— کتنی زبردست اور خوبصورت تمہاری کاپی ہے۔

— تم واقعی ممتاز ہو۔

— تم ہمیشہ کوئی کارنامہ ہی کرتی ہو۔

— تم واقعی بہت اچھے لڑکے ہو۔

حوصلہ افزائی:

— شکریہ! اس سے مجھے بڑی مدد ملی۔

— ٹھیک ہے، یہ کام تم ایسے ہی کیا کرو۔

— میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم گزشتہ ماہ کے بالمقابل اس مہینہ کچھ بہتر ہوئے ہو۔

— کیا اس کام میں تم میری مدد کر سکتے ہو۔

گھر والوں کا خود غور کرنا اور اپنے آپ سے سوال کرنا بہتر ہوگا کہ کون سا بچہ سب سے زیادہ کم ہمت ہے، اور کس کے اندر خود اعتمادی کی سب سے زیادہ کمی ہے، کہ آئندہ ہفتہ وہ مندرجہ ذیل طریقوں کو استعمال کر کے اس کی حوصلہ افزائی کر سکیں۔

— اگر اس نے کسی چیز کے حصول میں کوشش کی ہے تو اس پر توجہ دیں۔

— اگر وہ آگے بڑھا ہے، کچھ نیا حاصل Acheave کیا ہے تو اس کو سراہیں۔

— اس کو کچھ نئی ذمہ داریاں دیں۔

— اس کی اہمیت اجاگر کریں، اس کے احترام کا اظہار کریں، اس سے اس طرح کے کلمات کہیں ''شکریہ''، ''اگر ممکن ہو'' (تو ایسا کرو)، ''افسوس'' ہے (کہ ایسا ہوا) ان جملوں سے اس کی اہمیت اور اس کے احترام کا اظہار ہوگا۔

— اس کے ساتھ کچھ وقت گزاریں، اس کی باتیں خاص طور پر توجہ سے سنیں۔

—اس کے سامنے اس طرح مسکرائیں جس سے آرام و سکون کی نفسیات کا اظہار ہو۔

— اس کی دلچسپیوں اور اس کی خواہشات پر شوق کا اظہار کریں۔

عملی موقف اور مثالیں:

مثلاً نعمان پندرہ سال کا لڑکا ہے، مزاجاً پریشان و مضطرب رہتا ہے، آئندہ ہفتہ اس کے امتحانات ہیں اور اس کو خوف ہے کہ وہ فیل ہوجائے گا۔

— غور کرنے کی بات یہ ہے کہ

ایسی صورت میں وہ کون سی باتیں ہیں جو اس کے لیے بالکل معاون نہیں ہوتیں، مگر اہل خانہ بار بار وہی باتیں دوہراتے ہیں؟ کیا اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے تنقید یا مبالغہ آمیز تعریف مفید ہوگی؟ اس صورت میں نعمان کا Moral بڑھانے کے لیے اس کی حوصلہ افزائی کے لیے اہل خانہ کیا کر سکتے ہیں اور کون سے جملے استعمال کر سکتے ہیں؟

پانچ سالہ معاذ نے اپنا بستر درست کیا، اگرچہ ٹھیک سے چادر نہیں بچھا پایا مگر اپنے فعل پر تعریف و حوصلہ افزائی کے لیے دوڑا ہوا اپنی ماں کے پاس آیا اور کہنے لگا ''اماں اماں دیکھیے میں نے خود سے اپنا بستر درست کرلیا''۔

— غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ایسے موقع پر اہل خانہ کیا افسوسناک عمل کرتے ہیں اور کس قسم کی منفی بات کرتے ہیں؟

— ماں اس موقع پر بستر صحیح کرنے کی تربیت دینے کے لیے اور بچے کی کوششوں پر اس کے اعتماد کو بڑھانے کے لیے کیا اقدامات کرسکتی تھی؟

— دس سال کی بچی آمنہ کہتی ہے، ابو جان میرا یہ ہوم ورک ابھی مشکل ہے، کیا آپ اس میں میری کچھ مدد کر سکتے ہیں؟

— غور کیجئے ایسے موقع پر بعض والدین کیسی ہمت شکن باتیں کرتے ہیں؟

— یہ بھی سوچئے ایسے موقع پر آپ کس طرح اس طور پر آمنہ کی مدد کر سکتے ہیں کہ آپ کو خود ہی اس کا پورا کام بھی نہ کرنا پڑے اور اس کی مدد بھی ہوجائے۔

تین سال کی بچی فاطمہ اپنی ماں کے ساتھ کچھ گھریلو ضرورت کے سامان بازار سے خرید کر گھر واپس آئی اور فوراً ہی یہ بچی تھیلا کھول کر سامان نکالنے لگی، مثلاً اس نے انڈے نکالا اور فریج میں صحیح جگہ پر انھیں رکھ دیا۔ وہ کہتی ہے ''اماں میں انڈے فریج میں رکھوں گی۔''

— اب سوچیے اس صورت میں وہ کون سی منفی باتیں ہوتی ہیں جو بعض والدین کرتے ہیں؟

— اس موقع پر اس بچی کی حوصلہ افزائی کیسے ہوسکتی تھی، کس طرح اس کے اندر تعاون اور شراکتِ عمل کی اس کی صلاحیت کو پختہ شعور میں تبدیل کیا جاسکتا تھا۔

اہل خانہ کے لیے نصیحتیں:

والدین کے لیے حوصلہ افزائی کے اسالیب وطریقوں کا سیکھنا بہت ضروری ہے، وسائل تربیت میں اس کی بڑی اہمیت ہے، مختلف نوعیت کے برتاؤ میں یہ بہت مؤثر ہے۔ حوصلہ افزائی کا شعور نہ صرف والدین کے لیے اطمینان کا باعث ہے بلکہ اس سے اولاد کو بڑا نفع ہوتا ہے۔

یہ بات بار بار آچکی ہے اور یہاں پھر دوہرائی جاتی ہے کہ غلطیوں پر تنبیہ اور خطا کی تصحیح کو مؤخر کر دینا بھی بسا اوقات بہت مفید ہوتا ہے، ضروری نہیں کہ بچہ جیسے ہی کسی غلطی کا ارتکاب کرے بس فوراً ہی والدین اس کی تصحیح میں لگ جائیں، بلکہ بسا اوقات وہ اس عمل کو مؤخر کردیں، بعد میں اطمینان سے گفتگو کریں۔

عام طور پر حوصلہ افزائی کے لیے تین طریقے ہوتے ہیں:

۱- ترقی اور بہتری پر نظر رکھیے، مثلاً بچے نے صفائی کی تو کہیے ''یہ جگہ اب پہلے سے زیادہ صاف معلوم ہوتی ہے''۔

۲- جو کوشش صرف کی گئی اس پر توجہ دیجئے، مثلاً بچے نے کوئی کام کرنے کی کوشش کی تو اس طرح ردعمل ہو، ''شکریہ تمہارا، تم نے پورا وقت یہ کام کرنے میں لگایا، حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ یہ کام اتنا آسان نہ تھا''۔

۳- خاص طور پر اپنے احساس اور کام کا جو اثر آپ پر ہوا اس کا اظہار کیجئے: مثلاً ''تمہارا شکریہ کہ تم نے اپنے شیر خوار بھائی کو سنبھال لیا اور اس دوران ہم نے ذرا سا آرام کرلیا''، ''مجھے تمہارا وہ طریقہ پسند آیا جو تم نے اس کام کو کرنے کے لیے اختیار کیا''۔

تربیت میں بچوں کا ایک دوسرے سے تقابل کبھی مفید نہیں ہوتا، اس سے ان میں اشتراک عمل، تعاون اور ہم آہنگی کے بجائے مقابلہ آرائی اور تصادم کی نفسیات پیدا ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔

اسی طرح ہمیشہ مبالغہ آرائی سے پرہیز کرنا چاہیے اور بچوں کے بارے میں اپنے تاثر کا پوری سچائی کے ساتھ اظہار کرنا چاہیے، یہ اظہار کبھی محض سر ہلا کر بھی ہوسکتا ہے یا ''اب پہلے سے اچھا ہے'' جیسے سادہ سے جملوں سے بھی ہوسکتا ہے۔

بچوں کے لیے یہ مفید ہے کہ والدین ان کی اس طرح مدد کریں کہ وہ خود اپنے کام کے نتیجہ اور اس کی حیثیت کا اندازہ کرسکیں، بجائے اس کے کہ والدین خود ہی ان کے کام کی قیمت بتادیں، بچوں کو اس کا عادی بنانے میں ان کی معاونت کرنا چاہیے کہ وہ خود اپنی کوشش اور اپنے عمل کا جائزہ لیں نہ کہ دوسروں کے ذریعہ لگائے گئے حکم پر توجہ دیں۔

خود والدین کے کام کا بچوں پر بڑا اثر پڑتا ہے، عملی شکل الفاظ کی تاثیر پر بھاری پڑتی ہے، اس لیے حوصلہ افزائی کے لیے سب سے اہم اور مؤثر طریقہ یہ ہے کہ والدین بچے کے ساتھ بیٹھیں اس کی باتیں سنیں، ان کا بچوں کے ساتھ بیٹھنا، زبانِ حال سے خود بچوں کو یہ سمجھا دے گا کہ: ''ہم کو تمہارے ساتھ بیٹھنا پسند ہے، تمہارے ساتھ بیٹھنے میں بڑا مزا آتا ہے''، اسی طرح اس کی حوصلہ افزائی کے لیے اس کو کچھ ذمہ داریاں دی جائیں، یہ عمل خود ہی اس کو یہ جملے بولے بغیر سمجھائے گا کہ: ''میں تم پر اعتماد کرتا ہوں، تم تو ذمہ دار بچے ہو''۔

علمائے نفسیات کا کہنا ہے کہ ''جس رویہ پر بار بار توجہ دی جاتی ہے وہ بار بار دوہرایا جاتا ہے اور جس پر بار بار توجہ نہیں دی جاتی وہ زائل ہو جاتا ہے''، اس اصول کی روشنی میں اگر غلط رویہ پر بار بار توجہ دی گئی اور اچھے برتاؤ سے اغماض برتا گیا تو یہ خلافِ مصلحت ہوگا، اس کے نتیجہ میں غلط رویہ پروان چڑھے گا اور اچھا برتاؤ اپنی موت مرجائے گا۔

کچھ والدین کے تبصرے:

- مجھے لگتا ہے کہ میں زندگی بھر اپنے بچوں کی تعریف میں مبالغہ کرتا رہا، اب سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں، انسان کے لیے بہت مشکل ہے کہ سالہا سال گذرنے کے بعد اس صورت حال کو تبدیل کرے۔
- اس فصل میں جو مثالیں پیش کی گئیں اس میں سے بعض کو پڑھ کر میں نے دل میں محسوس کیا کہ ''میں تو زندگی بھر اپنے بچوں کے ساتھ یہی کرتی رہی، میں دن بھر ان کی غلطیوں کو پکڑنے کے لیے ان کے پیچھے لگی رہتی تاکہ ان کو ٹوک سکوں اور متنبہ کرسکوں، حقیقت یہ ہے کہ اب میں سوچتی ہوں تو خود مجھے یہ پسند نہیں کہ اپنی جیسی ماں کے ساتھ میں گھر میں زندگی گزار سکوں۔
- میری تربیت کچھ اس طرح ہوئی کہ ساری زندگی مجھے شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا، میرے والد بہت سخت تھے، جیسے ہی میں کوئی غلطی کرتا فوراً ٹوکتے، صحیح بات ہے کہ اس صورت میں زندگی بہت مشکل ہوجاتی ہے، حوصلہ افزائی سے متعلق یہ چیزیں پڑھ کر مجھے نہیں لگتا کہ مجھے کوئی نقصان ہوا البتہ اس ماحول نے

مجھے بہت سخت اور مضبوط بنا دیا، اس وقت حوصلہ افزائی سے متعلق یہ چیزیں پڑھ کر مجھے سخت افسوس ہو رہا ہے اور میں سوچتا ہوں کہ کاش میں اپنے بچوں کو ان کی حقیقی زندگی کا دوبارہ مزا دے سکتی۔

• میری بیٹی سے پیالہ ٹوٹ گیا، اس پر احساس خطا کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں، یہ بات صاف تھی کہ وہ ہمیشہ کی طرح میری ڈانٹ ڈپٹ سے خائف تھی مگر میں نے اس کو اپنے بازوؤں میں بھر کے چمٹا لیا، تو وہ رونے لگی، اس کی آنکھ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ یقین نہیں کر پا رہی تھی کہ میں غصہ نہیں ہوئی، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہ پیالہ مجھ کو کس قدر عزیز تھا اور میں اس کی کتنی احتیاط کرتی تھی۔

جب سے میں نے حوصلہ افزائی کا عمل شروع کیا ہے، مجھے احساس ہوا کہ بچوں میں کیسی کیسی صلاحیتوں کو پروان چڑھایا جا سکتا ہے اور اس کے سبب ان کی زندگی کس قدر پرسکون ہو جاتی ہے، نشوونما کس قدر بہتر ہو جاتی ہے اور بچے کس قدر سعادت مند ہو جاتے ہیں، اس حوصلہ افزائی کا فائدہ صرف بچوں کو ہی نہیں ملتا بلکہ اس سے میں خود بھی سکون محسوس کرتی ہوں، میرے شوہر اور دیگر لوگ بھی راحت محسوس کرتے ہیں۔

• میں ایک ہفتہ تک اچھی طرح اپنے بچے کے ایسے کاموں کا جائزہ لیتی رہی جس پر میں اس کی حوصلہ افزائی کر سکوں، لیکن جمعہ کی شام کو میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی اور ہفتہ بھر کی کوشش کہ میں نے ایک منٹ میں ضائع کر دیا، دراصل وہ پریشان بہت کر رہا تھا لیکن پھر تھوڑی دیر بعد میں نے اس سے معذرت کر لی اور کچھ دیر ساتھ بیٹھ کر محبت بھری باتیں کیں، اس طرح کے اعتذار کی میں پہلے سے عادی نہ تھی مگر اب میں اپنے اندر پہلے سے زیادہ تحمل محسوس کرتی ہوں۔

• میرے خاص تجربہ کے مطابق بچوں کے لیے سب سے اچھی حوصلہ افزائی یہ ہے کہ ان کے ساتھ کچھ وقت گذارا جائے، چنانچہ میں کچھ وقت ان کے ساتھ گذارتی ہوں خواہ صرف اکٹھا بیٹھنا ہی کیوں نہ ہو، لیکن اس دوران میں ان کے لیے ایک دوست کی طرح ہوتی ہوں، میں ان سے کچھ سوالات کرتی ہوں اور دیکھتی ہوں وہ کیا کر رہے ہیں اور کون سی نئی چیزوں کا اکتشاف کر رہے ہیں، حوصلہ افزائی صرف الفاظ سے ہی نہیں ہوتی۔

• میں نے عدنان سے باغیچہ کی گھاس کاٹنے کو کہا تو اس نے جواب دیا: ''کیا آپ سمجھتی ہیں کہ میں خادم ہوں جو گھر کا سب کام کروں، ویسے میں گھاس کاٹنے کی مشین نہیں چلا سکتا''، میں نے اس سے کہا، ''ارے عدنان اگر تم یہ کام کر لیتے تو مجھے اس سے خوشی ہوتی اگرچہ یہ کام کوئی تم پر فرض نہیں ہے، دراصل گذشتہ مہینہ جب گھاس بڑی ہوگئی تھی تو تم نے از خود کتر ڈالا تھا، میں تو بس اس اعتراف کا اظہار چاہتی تھی کہ تم نے اپنے حصے کا کام کیا ہے'' یہ کہہ کر میں دوسرے کام میں لگ گئی اور عدنان کو چھوڑ دیا، چند منٹوں کے بعد دیکھا کہ عدنان خود ہی بڑی محنت سے گھاس کاٹنے لگا، حوصلہ افزائی کے ان الفاظ و انداز نے اس پر بہت اچھا اثر ڈالا۔

• میری بیٹی سمیرہ کو ڈرائنگ کی قدرتی صلاحیت ملی ہے، میں نے اس سے بار بار اس کا ذکر کیا اور کہا کہ میں تمہاری ڈرائنگ کی خوبصورتی سے متاثر ہوں لیکن حوصلہ افزائی کے متعلق تفصیلات پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ عمل کے ذریعہ تشجیع الفاظ سے بہتر ہے۔ چنانچہ میں نے اس کی ایک ڈرائنگ لی اور اسے فریم کرا کر اپنے کمرے میں لگا دیا، مجھے نہیں لگتا کہ میری کسی گفتگو اور کسی جملے سے اس کی اتنی حوصلہ افزائی ہوئی ہوگی جتنی میرے اس عمل سے ہوئی۔

☆☆☆

تیسرا جدول

ہمت شکنی کرنے والے والدین	ان کے عام تبصرے	حوصلہ افزائی کرنے والے والدین	ان کے عام تبصرے
نتائج کے متمنی ہوتے ہیں، کامیابی پر توجہ دیتے ہیں، کوشش پر توجہ نہیں دیتے اور نہ ہی اس کو اہمیت دیتے ہیں۔	تم نے دس میں سے پانچ غلط کیا، تمہارے لیے لازمی ہے کہ تم اس سے بہتر کرو۔	صرف کامیابی پر توجہ نہیں دیتے ہیں، بلکہ ادنیٰ سی کوشش کو بھی اہمیت دیتے ہیں، مطمئن ہوتے ہیں اور بچے کو ہر حال میں قبول کرتے ہیں۔	تم نے دس میں سے پانچ صحیح کیا، ہمیں امید ہے کہ آئندہ تم اور اچھی کوشش کروگے۔
کامیابیوں کا مطالبہ کرتے ہیں، بہتری اور آگے بڑھنے پر توجہ نہیں دیتے، ہمیشہ بچے کا دوسرے بچوں سے تقابل کرتے ہیں۔	ذرا فلاں کو دیکھو اس کام میں وہ تم سے کس قدر بہتر اور پختہ ہے، تم اپنا بھی وقت ضائع کر رہے ہو اور میرا بھی۔	تھوڑی سی بہتری اور ذرا سا آگے بڑھنے پر بھی مبارکباد دیتے ہیں، صرف کامیابی کے ہی انتظار میں نہیں رہتے۔	بہت اچھا، لگتا ہے اب تم نے اس کام کو اور اچھے طریقے سے کرنا شروع کر دیا ہے۔
بچوں کے لیے بہت کام کرتے ہیں گویا ایک طرح سے وہ صرف بچوں کے خادم ہوں۔	ذرا انتظار کرو میں پہلے تمہارے بال سلجھا دوں پھر تمہارے جوتے تلاش کر کے دیتی ہوں۔	بچوں میں ذمہ داری اٹھانے کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں، بچوں کو تجربہ کرنے کا موقع دیتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ بچہ اپنی غلطی سے سیکھے۔	''اب ذرا دودھ کو آٹے میں ملاؤ دیکھو کیا ہوتا ہے''۔
ہمیشہ نتیجہ دیکھنا چاہتے ہیں، بچے کے رویے کو ہی غلط ٹھہراتے ہیں، انکے اندر تسلط اور حاکمیت کی نفسیات ہوتی ہیں۔	چپ ہو جاؤ، دفع ہو جاؤ، خبردار جو دوبارہ مجھ سے اس طرح گفتگو کی۔	بچے کی بات پر ہمیشہ توجہ دیتے ہیں اور غور سے سنتے ہیں۔	''اچھا اچھا اب میں سمجھ گیا، لگتا ہے اس ہفتہ تمہارا کام مشکل تھا''۔
مصنوعی تعریف کرتے ہیں، تعریف میں مبالغہ ہوتا ہے، سچائی اور اخلاص کا فقدان ہوتا ہے۔	تم واقعی بہت اچھے ہو، سب لوگ تم کو پیار کرتے ہیں۔	بچے کی مناسبت سے گفتگو کرتے ہیں، گفتگو میں اخلاص ہوتا ہے، عام جملے نہیں کہتے۔	تمہارا یہ کپڑا مجھے بہت اچھا لگا، یہ تو بالکل تمہارے بالوں کے رنگ سے ملتا جلتا ہے۔
تملق کا انداز اختیار کرتے ہیں اور غیر واقعی طریقے سے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔	بہتر ہے بیٹا تم نے یہ کام صحیح کیا ہے، اور تم تو ہمیشہ ہی یہ کرتے رہتے ہو۔	اچھی طرح بچے کی بات سنتے ہیں اور اس کو موقع دیتے ہیں کہ وہ خود اپنے کام پر اپنی رائے ظاہر کرے۔	اب تمہارا کیا خیال ہے، اب تک جو تم نے حاصل کیا ہے اس کے بارے میں کیا محسوس کرتے ہو۔
دھمکاتے ہیں، حکم دیتے ہیں، مسلط رہتے ہیں اور بار بار ذمہ داریاں یاد دلاتے ہیں۔	چلو جلدی کرو، بس اسی وقت اپنے بستر پر جاؤ، ورنہ پھر میں تم کو..... (پانچویں مرتبہ دھمکی)	بچے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ وہ خود فیصلہ کرے اور پھر ان فیصلوں کے نتائج کو برداشت کرے۔	کوئی حرج نہیں، اس میں تو ہم سب سے خطا ہوتی ہے لیکن اس پر تم غور کرو کہ اس سے تمہارے لیے کیا سیکھنا ممکن ہے۔
تنقید کرتے ہیں اور تاک میں رہتے ہیں کہ بچے غلطی کریں اور غلط بات کریں او اور وہ ٹوکیں۔	دیکھو تم نے کیا کیا، کیوں تم اسی طرح احمق بنے رہنا چاہتے ہو۔	مثبت چیزوں پر نظر رکھتے ہیں، اور بہت سکون و اطمینان کے ساتھ کسی مسئلہ کو حل کرتے ہیں۔	دیکھو ایک ساتھ مل کر ہم نے کیا کام کیا یعنی کیا Acheave کیا ہے، میری خوش نصیبی ہے کہ تم نے میرا ساتھ دیا ورنہ دیر تک کرنے کے بعد بھی میں یہ کام ختم نہ کر پاتا۔

☆☆☆

فقہیات

قربانی- احکام و مسائل

صدام حسین ندوی

سوال۱- قربانی کس شخص پر واجب ہوتی ہے؟

جواب: آزاد مسلمان مقیم صاحبِ نصاب (جو روپیہ پیسہ، سونا، چاندی یا مال تجارت یا ضرورت سے زائد ساز وسامان کا مالک ہو) پر قربانی واجب ہے۔ (مجمع الأنصر۴/۱۶۶)

سوال۲- کن جانوروں کی قربانی درست ہے؟

جواب: مندرجہ ذیل جانوروں کی قربانی درست ہے خواہ وہ نر ہو یا مادہ:

(۱) بکری (جس کے ضمن میں پالتو بھیڑ، دنبہ اور مینڈھے وغیرہ بھی شامل ہیں)۔

(۲) اونٹ، گائے (جس کے ضمن میں بھینس بھی شامل ہے)۔ (ہندیہ قدیم ۵/۲۹۷)

سوال۳- جانوروں کی عمر کتنی ہو؟

اگر چھوٹے جانور ہوں جیسے بکرا، بکری وغیرہ تو ان کے لیے مکمل ایک سال کا ہونا ضروری ہے البتہ بھیڑ اگر چھ مہینے کی ہو لیکن صحت مند، توانا اور فربہ ہو تو کافی ہے اور اگر بڑے جانوروں میں گائے، بھینس وغیرہ ہوں تو مکمل دو سال کی ہونا ضروری ہے، البتہ اونٹ کے لیے ۵/سال کا ہونا شرط ہے۔ (درمختار مع ردالمحتار، ج۹/۴۶۶، ہندیہ ۵/۲۹۷)

سوال۴- عیب دار جانوروں کی قربانی درست ہے یا نہیں؟

جواب: اگر جانوروں میں سخت قسم کا عیب ہو تو قربانی درست نہیں جیسے:

(۱) جس جانور کے پیدائشی طور پر کان نہ ہوں، یا ہوں البتہ اکثر حصہ کٹا ہوا ہو۔

(۲) آنکھ کی بینائی بالکل، یا اکثر چلی گئی ہو۔

(۳) پوری دم ہو یا اکثر دم کٹی ہوئی ہو۔

(۴) دانت بالکل نہ ہوں یا اکثر ٹوٹ چکے ہوں۔

(۵) سینگ بالکل جڑ سے ٹوٹا ہو بایں طور کہ اس کا اثر دماغ تک پہنچ گیا ہو۔

(۶) زبان کٹا ہوا جانور جو چرنے پر قادر نہ ہو۔ بالکل لنگڑا ہو یا اس قدر لنگڑا ہو کہ تین پاؤں

(۷) زمین پر رکھتا ہو اور چوتھا پاؤں زمین پر رکھ ہی نہ سکتا ہو۔

(۸) اگر بکری کے دو تھنوں میں سے ایک تھن خشک ہو جائے یا کاٹ دیا جائے، یا گائے اونٹنی کے دو تھن کٹ جائیں یا خشک ہو جائیں۔

(۹) خنثی جانور (جس کے بارے میں پتہ ہی نہ چل پائے کہ نر ہے یا مادہ)۔

(۱۰) وحشی اور جنگلی جانور ہو۔

(۱۱) اسی طرح ایسے جانور کی قربانی بھی درست نہیں جو صرف گندگی اور غلاظت کھائے۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ کھائے۔

(ہندیہ۵/۲۹۷، درمختار مع ردالمحتار۹/۴۶۸/۴۷۰)

سوال۵- کس صورتوں میں قربانی کے گوشت کا فقراء میں صدقہ کرنا واجب ہے؟

جواب: اگر نذر کی بنا پر قربانی کرے یا میت کی وصیت کی بنیاد پر اسی کے مال سے قربانی کرے تو ایسی صورت میں قربانی کے گوشت کو فقراء میں صدقہ کرنا واجب ہے۔ یا قربانی کا جانور خریدا گیا اور اس نے بچہ جنا، تو اس بچہ کو صدقہ کرنا لازم ہے، اسی طرح اگر سات حصہ داروں میں سے کسی حصہ دار نے سال گزشتہ کی قربانی کی قضاء کی نیت کر لی تو اب پورے جانور کو صدقہ کرنا واجب ہے۔

(ردالمحتار ج۹/۴۷۴)

سوال۶- اگر قربانی کا جانور دودھ دینے والا ہو تو کیا کریں؟

جواب: اگر قربانی کے لیے متعین کردہ گائے یا بھینس دودھ دینے والی ہو تو اس کا دودھ یا تو نکالیں ہی نہیں یا ضروری ہو تو دودھ دوہنے کے بعد صدقہ کر دیں۔

(الدر مع الرد۹/۴۷۶)

سوال۷- قصاب کی اجرت جانور کے گوشت یا چمڑے میں سے دینا کیسا ہے؟

جواب: قصاب کو جانور میں سے اجرت دینا درست نہیں۔

(درمختار۹/۴۷۵)

سوال۹- تکبیر تشریق کسے کہتے ہیں؟

جواب: تکبیر تشریق یہ ہے: **اللہ أکبر اللہ أکبر لا إلہ إلا اللہ واللہ أکبر اللہ أکبر ولله الحمد.**

(درمختار۳/۶۲)

سوال۱۰- تکبیر تشریق کن لوگوں پر اور کن ایام میں پڑھنا واجب ہے؟

جواب: تکبیر تشریق نویں ذی الحجہ کی فجر کی نماز سے لے کر ۱۳/ ذی الحجہ کی عصر کی نماز تک ہر فرض نماز کے بعد منفرد، امام، مقتدی، مرد، عورت سب پر پڑھنا واجب ہے، البتہ عورت آہستہ آواز سے پڑھے گی۔

(ہندیہ۱/۱۶۷)

سوال۱۱- کیا مسبوق بھی تکبیر تشریق پڑھے گا؟

جواب: مسبوق شخص اپنا سلام پھیرنے کے بعد تکبیر تشریق پڑھے گا۔

(ہندیہ۱/ ۱۶۸)

☆☆☆

منصوبہ بندی

سانحہ نہیں ٹلتا سانحے پہ رونے سے!

عبدالرشید طلحہ نعمانی

ہندوستان کا سیاسی منظرنامہ نہایت تیزی کے ساتھ ہندوتوا کی طرف بڑھتا جارہا ہے، آج کا مسلمان سماجی اعتبار سے کشمکش کے دوراہے پر کھڑا ملک کی موجودہ صورت حال پر ماتم کناں اور چاک گریباں ہے۔ جب کہ دوسری طرف یکے بعد دیگرے مسلسل کامیابیوں کے نتیجہ میں زعفرانی تنظیموں نے اپنے حوصلوں کو بلندتر اور سازشوں کو تیزتر کردیا ہے اور اس بات میں بھی ادنی شک وتردد کی گنجائش نہیں کہ ان فتوحات وکامرانیوں کے پیچھے آرایس ایس کی پیہم محنت، طویل جدوجہد اور زبردست منصوبہ بندی ہے؛ جو نظام قدرت کے تحت آج ان کا مقدر بن چکی ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب سے ہندو شدت پسند ذہنیت اقتدار کی کرسی پر غیر معمولی کامیابی کے ساتھ دوبارہ براجمان ہوئی تب سے موب لنچنگ کا نا تھمنے والا سلسلہ پھر سے شروع ہوگیا، بابری مسجد کے حوالے سے مختلف بیان بازیاں ہونی لگیں، ہزار مخالفت کے باوجود تین طلاق بل کابینہ میں منظور ہوکر پارلیمنٹ پہونچ گیا اور ان کے علاوہ دیگر منصوبوں کو روبہ عمل لانے کی کوششیں بھی عروج پر پہونچ گئیں۔

بہ نظر غائر دیکھا جائے تو اس وقت مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ عدم تحفظ کا ہے، اس احساس نے انہیں ہمیشہ ترقی کی راہ میں آگے بڑھنے سے روکا ہے اور رفتہ رفتہ یہ سلسلہ طول پکڑتا جارہا ہے۔ نفرت وتعصب اور تشدد وانتہا پسندی کا یہ رجحان اگر یوں ہی پنپتا رہا، اس پر قابو پانے کی کوشش نہ کی گئی اور شر پسند عناصر پر کاری ضرب نہ لگائی گئی تو اس کا نقصان صرف مسلمانوں کو ہی نہیں جھیلنا پڑے گا؛ بلکہ مجموعی طور پر جمہوریت کی جڑیں کمزور ہوں گی، ملک کی ترقی وخوشحالی کی رفتار پر روک لگے گی اور عالمی سطح پر ہندوستان کی شبیہ داغ دار ہوکر رہ جائے گی۔

اس جاں بہ لب اور روح فرسا ماحول میں اگر ہم اپنا محاسبہ کریں، ناکامیوں کا تجزیہ کریں اور ان کے اسباب ومحرکات کا جائزہ لیں تو بنیادی طور پر درج ذیل عناصر کھل کر سامنے آتے ہیں: **مسلمانوں کی نری جذباتیت وناعاقبت اندیشی، تعلیمی و معاشی پس روی و پسماندگی، خوداحتسابی و منصوبہ بندی کا فقدان، مسلم قائدین کی منتشر یا غیر موثر حکمت عملی اور اپنے اپنے مفاد کی خاطر نام نہاد سیکولر پارٹیوں سے مفاہمت وسازباز وغیرہ۔**

نفرت وتعصب کی مذکورہ منظرکشی خلاف واقعہ نہیں ہے، ملک میں نفرت بڑھ رہی ہے، تشدد راہ پاتا جارہا ہے؛ مگر اس کے باوجود ہمیں مایوس ہونے یا تھک ہار کر بیٹھ جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان سب کے باوجود ملک میں ہمارے لیے روشن امکانات موجود ہیں، ان کی صحیح پہچان اور برمحل

استعمال ہی فلاح ونجات کا واحد راستہ ہے۔محض تشویش وتکلیف کا اظہار مخالفین کی بلند حوصلگی کا سبب تو ہوسکتا ہے؛ مگر صورت حال کا واقعی حل نہیں بن سکتا۔حکمت کا تقاضا ہے کہ اس ابتر ماحول کو بہتر بنانے کے راستے ڈھونڈے جائیں اور ان کی بھرپور نشان دہی کی جائے ؛ تاکہ ملک کے امن پسند وانصاف پرور افراد کے لیے روشنی کی کرن نمودار ہو اور راہ عمل فراہم ہو سکے۔اسی غرض سے ان پرآشوب حالات میں اسلامیان ہند کے تابناک مستقبل کے لئے اپنی ناقص فہم اور بڑوں کے قیمتی تجربات کی روشنی میں چند ضروی معروضات اور کرنے کے اہم کام پیش کرنے کی جسارت کررہا ہوں، اس امید کے ساتھ کہ

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

پہلا کام: ان حالات میں سب سے پہلے ہمیں انابت اور رجوع الی اللہ کی ضرورت ہے ؛ کیوں کہ ہم مسلمانوں پر جو نامساعد حالات آتے ہیں ان میں ہماری بے راہ روی اور خدا کی نافرمانی کو بڑا دخل ہے، ارشاد ربانی ہے :اور تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کیے ہوئے کاموں سے پہنچتی ہے اور بہت سے تو اللہ درگزر ہی کردیتا ہے۔ "(الشوری)

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لیے دو امانیں مجھ پر نازل فرمائیں۔(سورۂ انفال میں ارشا فرمایا گیا کہ) اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کرے گا کہ تم ان کے درمیان موجود ہو اور ان پر عذاب نازل کردے اور اللہ انھیں عذاب میں مبتلا نہیں کرے گا جب کہ وہ استغفار کرتے ہوں گے، معافی اور مغفرت کے طلبگار ہوتے ہوں گے ۔آپ ﷺ نے فرمایا: پھر جب میں گزر جاؤں گا تو قیامت تک کے لیے تمھارے درمیان استغفار کو (بطور امان) چھوڑ جاؤں گا۔(ترمذی)

آج توبہ واستغفار اور رجوع الی اللہ کی یہ تحریک ہی ہمیں مسائل کے دلدل سے نکال سکتی ہے؛ اس لیے ہمیں اپنے احتساب اور اجتماعی کے ساتھ ساتھ انفرادی گناہوں سے بھی توبہ کی ضرورت ہے۔

دوسرا کام: آج دنیا بھر میں عموماً اور ہندوستان میں خصوصاً مسلمان جن مصائب اور آفات کا شکار ہیں ان کا سب سے بڑا سبب آپس کا تفرقہ اور خانہ جنگی ہے ورنہ عددی کثرت اور مادی اسباب ووسائل کے اعتبار سے مسلمانوں کو سابقہ ادوار میں ایسی طاقت حاصل نہ تھی جیسی آج حاصل ہے ۔اگر آج امتِ مسلمہ پر نظر دوڑائی جائے تو یہ امت واحدہ کے بجائے ایک منتشر ہجوم نظر آتی ہے؛ جس میں دور دور تک کسی اتحاد کا امکان دکھائی نہیں دیتا۔ایسے مخالف ماحول میں اپنے آپ کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دینا ہمارے شعور ایمانی کے خلاف ہے ؛بل کہ ہم سنجیدگی، معروضیت اور حساسیت کے ساتھ اپنی سیاسی غرض مندیوں سے اوپر اٹھ کر ملی فکرمندی کا ثبوت دیں، ہم ٹکڑیوں میں بٹنے کی بجائے کم ازکم اپنے اوپر آنے والی اجتماعی آفت سے نمٹنے کے لیے متحد ہوجائیں۔

مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی نائب ناظم امارت شرعیہ ارقام فرماتے ہیں کہ اتحاد امت کا مطلب تمام مذاہب ومسالک کا ادغام یا تمام مذاہب ومسالک سے مشترکہ چیزوں کو لے کر نیا مذہب بنانا نہیں ہے ؛ بلکہ اتحاد امت کا مطلب اپنے مسلک ومذہب پر عامل رہتے ہوئے دوسرے مسلک ومذہب والوں کا احترام اور فروعی مسائل کو نزاعی بنانے سے اجتناب ہے؛ اسی طرح اختلاف رائے سے مراد وہ اختلاف وافتراق ہے جو امت اجابت کے درمیان ہے، امت دعوت

یعنی غیر مسلموں سے اتحاد مراد نہیں ہے۔اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مسلمان ایک امت ہیں، ان کے اتحاد کی بنیاد کلمہ، قبلہ، کتاب اور رسول کا ایک ہونا ہے، ان کے علاوہ عقیدۂ آخرت، دخول جنت وجہنم، نماز، روزہ، حج وزکوٰۃ کی فرضیت، جہاد اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی مشروعیت میں سبھی متحد ومتفق ہیں؛ اس لیے مسلمان ایک امت ہیں؛ بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو دو آسمانی مذاہب کے ماننے والے یہودی اور نصرانی تک کو بعض امور مشترکہ کی وجہ سے ایک امت کہہ کر ان کے خلجان اور خدشات کو دور کیا، جس کا حاصل یہ ہے کہ جو دین اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا اور انبیاء سابقین جس دین کے حامل رہے، وہ ایک ہی دین، دین توحید ہے اور جس ملت کے داعی رہے وہ ملت اسلام ہے، لوگوں نے پھوٹ ڈال کر اصل دین کو پارہ پارہ کر دیا اور الگ الگ راہیں نکال لیں، نفسانی خواہشات اور اتباع ہویٰ کی وجہ سے لوگ فرقوں اور ٹکڑوں میں بٹ گیے اور ہر فرقہ اپنے کو اچھا اور دوسرے کو گھٹیا اور ذلیل سمجھنے لگا، رسولوں کی واضح ہدایات کو پس پشت ڈال کر دین کو بازیچۂ اطفال بنا دیا اور اپنے عقائد وخیالات کو اصل دین کی جگہ دے کر ہر گروہ مسرور وشاد ماں اور اپنی غفلت، ضلالت اور جہالت کے نشے میں سرشار ہے۔

تیسرا کام: اس وقت مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز ماحول اور فرقہ وارانہ ذہن بنا کر دشمنی وعداوت کی جو کھائیاں پیدا کی جارہی ہیں انھیں پاٹ کر برادران وطن تک محبت وانسانیت کا پیغام پہنچانے کی ضرورت ہے، بہ حیثیت "خیر امت" ہماری دینی ذمہ داری ہے کہ ہم برادران وطن سے اپنے فاصلے کم کریں، خواہ وہ آر ایس ایس اور شدت پسند ہندو تنظیموں کے کارکنان کیوں نہ ہوں، ہم ایک مستقل لائحہ عمل کے ساتھ ان سے ملیں، بہ راہ راست ایک ایک فرد تک پہنچنے کی کوشش کریں، یہ ہمارا کتنا بڑا اجتماعی جرم ہے کہ کائنات کی سب سے بڑی صداقت "اسلام" جس کے ہم امین ہیں، ملک کی اکثریت تک اسے پہنچانے کے حوالے سے اب تک ہم کوئی لائحہ عمل بھی تیار نہ کر سکے۔

معروف دانشور وادیب پروفیسر محسن عثمانی لکھتے ہیں کہ "غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک کا مطلب مداہنت نہیں ہے یعنی ہمیں دین وایمان کے کسی جز سے دستبردار ہونے کی ضرورت نہیں؛ لیکن ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ ظلم وستم کی دلدوز تاریخ کے باوجود ملک کے خمیر میں شرافت اور روحانیت کا جز بھی موجود ہے خاکستر میں دبی ہوئی اس چنگاری کو شرارہ بنانے کی ضرورت ہے، اس کے لئے ہمیں متصوفانہ نرمی فراخ دلی وسعت نظری اور توسع اختیار کرنے کی ضرورت ہوگی، خدمت خلق اور خدمت انسانیت کو اپنا شعار بنانا ہوگا اور ضرورت پیش آجائے تو عارضی طور پر مستقبل کے بڑے فائدہ کے لئے اور حقوق کی بازیابی کے لئے اپنے کسی جائز حق سے بھی دست برداری اختیار کی جاسکتی ہے۔ یہ حلال کو حرام کرنا نہیں ہے بلکہ حکمت عملی ہے، اور اعتماد کی بحالی اور خلیج کو پاٹنے کی ایک کوشش ہے۔"

چوتھا کام: ہر ذی شعور وصاحب ادراک اس بات سے ضرور اتفاق کرے گا کہ قوموں کی صلاح وفساد میں تعلیم و خواندگی کا بڑا دخل ہے، تعلیم ہی انسان کو انسان بناتی ہے اور زیورِ تہذیب وتمدن سے آراستہ کرتی ہے، جو قومیں تعلیم میں پیچھے رہ جاتی ہیں وہ اقوام عالم میں اپنا مقام نہیں بنا پاتیں۔ ایک زمانہ تھا کہ مسلم اور عرب علماء نے سائنس اور طب کے میدانوں میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جسے آج بھی مغربی دنیا اپنی ارتقائی کوششوں کے باوجود فراموش نہیں کر سکی اور نہ آئندہ کر سکتی ہے۔

ہندوستان کے موجودہ حالات میں ملک دشمن

عناصر کا جواب دینے کے لئے مسلمانوں میں تعلیمی بیداری اور دینی شعور کا پیدا ہونا بھی نہایت ضروری ہے؛ اس لئے کہ تعلیم ایک خاموش انقلاب کا ذریعہ اور زبردست ارتقاء کا وسیلہ ہے، اس کے لیے زبانی جمع خرچ یا جلسہ اور کانفرنس کی ضرورت نہیں ؛ بلکہ مقامی مسلم آبادی کو متحرک کیا جائے اور انہیں تعلیم وتربیت کی اہمیت بتائی جائے تو یقیناً اتنے وسائل مہیا کئے جاسکتے ہیں جن سے مقامی سکول وکالج کو چلایا جاسکے، البتہ اس اسکول کا نصاب مغربی تعلیم کا چربہ نہ ہو، بلکہ یہ نصاب اسلامی نظریۂ علم اور اسلامی کلچر پر مبنی ہو، ان اسکولوں میں مسلم طلبہ کو نہ صرف صحیح خطوط پر تعلیم دی جائے بلکہ ان کی تربیت بھی کی جائے ،یعنی تعمیر سیرت اور کردار سازی اس کا لازمی حصہ اور نتیجہ ہو، اس سے بڑی تعداد میں ایسے افراد تیار ہونا شروع ہوجائیں گے جو قوم وطن کے سچے ہمدرد اور بہی خواہ ہونگے ، ملک کی تعمیر وترقی کے لئے مثبت کردار ادا کریں گے، جو خود اپنی زندگی میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے والے ہوں گے اور اپنے عمل وکردار سے دوسروں کے لئے راہ عمل متعین کریں گے اس طرح سے تعمیر ملک وملت کی فضا ہموار ہوگی۔

پانچواں کام: ہمارے زوال کے اسباب میں سے ایک بڑا اور اہم سبب خود احتسابی وخود شناسی سے دوری اور منظّم منصوبہ بندی کی کمی ہے ۔خود احتسابی دنیا کے مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے؛ کیونکہ انسان اپنی فطرت کے مطابق خود کو خامیوں سے پاک سمجھتے ہوئے تمام غلطیوں کا ذمے دار دوسروں کو ٹھہراتا ہے ۔خود کو جانچنا، اپنی غلطیوں، خامیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کر کے ان کی اصلاح کرنا اور اپنے ہر عمل کا خود حساب رکھنا "خود احتسابی" کہلاتا ہے ۔من حیث القوم اس عمل کی اہمیت دوچند ہوجاتی ہے ،خاص کر حالات حاضرہ میں اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے کہ ہم اپنی خطاؤں کا تجزیہ کریں، کمیوں کو دور کرنے کی فکر کریں اور مستقبل بینی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے لئے مناسب لائحہ عمل تیار کریں!

اسی طرح کسی کام کو کرنے سے پہلے اس کا پروگرام بنانا، اہداف ومقاصد طے کرنے کے ساتھ طریقہ کار اور وسائل متعین کرنا، اس کے فوائد ونقصانات سے واقفیت ومعرفت، کام کو آسان، محکم اور کامیاب بنانے میں اہم رول ادا کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ پلاننگ ومنصوبہ بندی کی ہر میدان میں بڑی اہمیت ہے، خواہ وہ سیاسی ہو یا اقتصادی، علمی ہو یا عملی، دینی ہو یا دنیاوی، انتظامی ہو یا دعوتی۔

مختصر یہ کہ حکومت وقت کے تئیں لاحاصل تبصروں، بے جا تذکروں اور بے محل مشوروں سے کئی گنا بہتر اپنی غلطیوں کا تدارک اور خامیوں کی اصلاح ہے۔جس دن ہماری قوم اور اس کے قائدین گفتار کے بجائے کردار کے غازی بن جائیں گے ،ہر اقدام سے پہلے خود احتسابی اور منصوبہ بندی کو اپنا آئین بنالیں گے اور اجتماعی وملی مفادات کے لئے بے غرض ہوکر اپنی خدمات انجام دیں گے اس دن حقوق کی بازیابی کے لئے نہ کسی مہم کی ضرورت ہوگی نہ کانفرنس کی۔

اخیر میں اقبال مرحوم کی اس دعاء پر قلم روکتا ہوں:

یا رب! دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے، جو روح کو تڑپا دے
بے لوث محبت ہو، بے باک صداقت ہو
سینوں میں اجالا کر، دل صورت مینا دے
احساس عنایت کر آثار مصیبت کا
امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے

☆☆☆